

175

آنسعدن گیلانی

پکار

اداره ادب اسلامی ۵ سرگودھا

۲۹۷۶۴
۱۳۸۷
۱۷۹۲۱

DATA ENTERED

پہلی بار :- ۱۹۶۳ء
ناشر :- ادارہ ادب اسلامی، سرگودھا
طابع :- ثنائی پریس سرگودھا

بھارت میں
ہماری مطبوعات مکتبہ تحلی، دیوبند دیوبند،
سے مل سکتی ہے

قیمت : ۰/۱ روپیہ

مکتبہ سید کلب عباس تمکین رقم سرگودھا

تہ تیہ

- ۷ حرفِ اول
- ۸ اسلامی تحریک
- ۱۰ چاند کا سلام
- ۱۴ لاشوں کے اٹبار
- ۱۹ زندگی کا تقاضا
- ۲۲ آزادی کا ماتم
- ۲۳ راکھ کے ڈھیر
- ۳۹ پیکار
- ۴۲ فریاد
- ۴۹ ایک بزرگ فرماتے ہیں
- ۵۴ مولوی اور مسلمان
- ۵۸ جیل کے نام
- ۶۲ یومِ عالمِ اسلام
- ۶۶ یہ مینا بازار ہے
- ۷۱ جدید اسلام
- ۸۲ ایک مقدمہ
- ۸۵ اجنبی کی آمد
- ۹۰ میرا دل چاہتا ہے۔

حرفِ اول

میرے ان مضامین کا مجموعہ بھی اسلامی ادب کی اس صنف سے متعلق رکھتا ہے۔ جسے
 تخریکِ ادب کہتے ہیں۔ ادب کی یہ قسم ہلکے پھلکے انداز میں مقصدِ زندگی کو زندہ و پابند
 رکھنے اور تابندہ تر کرنے کے کام آتی ہے۔ میرے تخریکِ مضامین کے
 پہلے دو مجموعے "تصویریں" اور "انتظار بھی" ایسی ادبی صنف کے نقوش ہیں۔ ان مضامین
 میں فہم و شعور کے ساتھ ساتھ ایک جذبہ فرادال رواں دواں رہتا ہے جو قلم کے
 لئے تندی کا کام کرتا ہے۔ یہ مضامین رفقاء سفر کے جذبات کے لئے دلولہ اور رفقاء سفر
 کے لئے مہمیز کا کام دے جاتیں تو ان کا مقصد تخریر پورا ہو جاتا ہے۔ بس ایسی
 مقصد کے لئے یہ مضامین تخریر اور مرتب کئے گئے ہیں۔ ان مضامین کا بیشتر حصہ
 ہفت روزہ "جہانِ نو" کراچی میں ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان شائع ہوتا رہا ہے اور
 مناسب نظر ثانی کے بعد اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ان کی قراہی اور ترتیب
 میں رفیع الدین اشہمی، ظفر علی شاہ، شاہ عبدالرحمن اور دوسرے جن اسلام پسند نوجوانوں نے
 میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ ان کا اجر نیت اور محنت کے مطابق
 ان کے اللہ کے ذمے ہے۔

دارالرحمت سرگودھا

اسد گیلانی
 ۶۳

اسلامی تحریک

اس نام سے ہے باقی آرام جہاں ہمارا
حضور کا نام آتے ہی مکہ کی گلیاں اور مدینہ کے وہ آیام نگاہوں میں پھرنے
گتے ہیں جب حضور دینِ حق کی کامیابی کے لئے وہاں اپنے شب و روز اللہ
کی راہ میں لگا رہے تھے۔ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ کاش اس وقت میں بھی موجود ہوتا
اس وقت حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہوتا۔ اس وقت حضور کے ارشادات اور
اشاروں پر جان لڑائی ہوتی۔ اور حضور کے قدموں پر جان دے دی ہوتی۔
لیکن جب خیالی آتا ہے کہ صدیوں سے وہ دینِ حقے حضور نے سر بلند اور
قائم کیا تھا دنیا پر غالب نہیں رہا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ زمانہ ہم سے پھر وہی
مطالبہ کر رہا ہے جو اس نے حضور اور آپ کے محترم ساتھیوں سے کیا تھا۔ اور
اس مطالبہ کا جواب ہمارے ذمہ اس وقت اسی طرح ہے جس طرح انہوں نے
اس وقت دیا تھا۔ اس سے دل میں ایک پُر خروش اضطراب بٹھکھڑا ہوتا ہے اور دل
چاہتا ہے کہ اسلام کی سر بلندی اور اقامت کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیا جائے
اسی سے دل کو سکون اور ٹھنڈک نصیب ہو سکتی ہے۔ پھر وہ ماحول سامنے آتا
ہے جو تمام تر مشکلات کا ماحول تھا اور اس سے ایمان اور نفاق کا فرق سمجھ میں

آنے لگتا ہے۔ اسی سے عزت اور معرکوں کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور اسی سے دشمن دین اور خادم دین قوتوں کا کردار سامنے آتا ہے۔ غرض زمانے کے بدل جانے کے باوجود اس وقت کے ماحول اور مشکلات کے مختلف مراحل ایک ایک کر کے جیب سامنے آتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے کہ یہ کام مدتوں سے التوا میں کیوں پڑا ہوا ہے۔

آج زمانے میں اگر اسلام کا نام ہے تو حضور کے عظیم ترین کردار کی لوح پر کندہ ہونے کے سبب سے ہے اور جس کو اسلام کی خدمت کرنا ہو اسے اس کو فائدہ کی مخلصانہ پیروی کئے بغیر بالکل چارہ نہیں ہے۔
 یہ مصطفیٰ برسوں خوش را کہ دیں ہمہ اوست
 اگر بر او نہ رسیدی تمام بولہبی اوست

چاند کا سلام

یہ چاند مدت سے ہمیں دیکھتا آیا تھا کہ ہم نے کفر اور جہالت کے سامنے
 ڈگنیں ڈال دی ہیں اور اس کے تصرف میں اپنے آپ کو دیدیا ہے۔ یہ چاند ہر سال
 آتا رہا اور ہمیں اسی مجبوری، بے بسی، الاجاری اور کس مہر سی کی حالت میں دیکھتا
 رہا۔ ہر سال وہ قدرت کی طرف سے تازہ روشنی کے ٹخنے لیکر آتا رہا اور ہر سال
 ہم سبے چارگی کا باسی سلام اس کے سامنے پیش کرتے رہے۔ ہر سال اس نے نئی
 امیدوں اور نئے حوصلوں سے افق کے پاس سے ہماری طرف جھانک کر عید
 کا سلام ہمیں دیا اور ہر سال ہم نے یہ کہہ کر اسے بالوس کر دیا کہ تیرے اللہ کے
 بندے بالوس و مجبور ہیں۔ امدان کے پاس کوئی ایسی سرزمین نہیں جہاں وہ اپنے
 رب کا دین قائم کر سکیں۔ ہر سال وہ امید بھری نظروں سے تکتا ہوا آیا اور ہر سال
 بالوس اور زرد چہرہ لٹے ہوئے وہ لوٹ گیا۔ ہم مدتوں اس سے خاموش وعدے
 کرتے رہے اور وہ مدتوں ہم سے خاموش تقاضے کرتا رہا۔

لیکن اب وہ ہمیں بے بس و مجبور دیکھنے نہیں آتا۔ ہم نے وہ بند غلامی توڑ
 ڈالے ہیں جو ہمیں اپنے رب سے کٹے ہوئے وعدوں سے فرار کی راہیں دکھاتا
 کرتے تھے۔ ہم کہا کرتے تھے: "آہ وہ خطہ زمین کہاں ہے جس میں ہم اکثریت

کے خوف سے بے خوف ہو کر اور جابر فرنگی کے جبر سے آزاد ہو کر اللہ کے دین کو سر بلند کریں۔ اللہ کا دین اور رسولؐ ناپاکیزہ آئوہ ہماری ہزار ہمت افزا تیاں کرتا تھا لیکن ہم کسی نئے خطہ زمین کی آرزو میں صرف افق پر نظریں جماتے رکھنے کے ہی عادی ہو گئے تھے۔ ایک محبوب خطہ زمین جہاں خدا کا قانون اپنی تمام برکتوں کے ساتھ انسانوں پر نافذ ہے۔ جہاں مسلمانوں کی زندگی کا سارا اثاثہ رضائے الہی کا حصول ہے۔ جہاں امن اور سلامتی ہے۔ جہاں عدل اور انصاف ہے۔ جہاں اخلاق اور سر بلندی ہے۔ جہاں پاکیزگی اور طہارت ہے۔ جہاں صداقت اور وعدہ و قالی ہے۔ جہاں رحمدلی اور خدا ترسی ہے۔ جہاں تقسیم بے یار و مددگار نہ ہوں۔ جہاں پورے کو بھوک اور بے آبروئی کا اندیشہ نہ ہو، جہاں ضعیف کو حکومت کی لاکھٹی کا سہارا ہو۔ جہاں طہارت نفس کی خوشگوار بادِ مہاری چلے۔ جہاں خوش خلقی اور خدا خونی کی خوشبوؤں سے فضائیں مہکی مہکی رہیں۔ جہاں پاسِ عہد، اہد احترامِ انسانیت سے دھوپ میں ٹھنکی ہو۔ جہاں رحم اور باہمی ہمدردی کی گرجی ہو، جہاں کمزوروں میں سورج کا سا وقار ہو۔ اور طاقتوروں میں چاند کی سی شفقت ہو۔ دور افق کے پار مسلمانوں نے ان خوابوں کو دیکھا تھا۔ ایک ایسا خطہ زمین جو پاک ہو اور جس کی فضاؤں میں صرف لا الہ کی گونج ہو، متحد ہو کر ایک زبان ہو کر سوادِ زمین سے بے نیاز ہو کر، اگر وہ پیش سے بے پروا ہو کر، آغاز و انجام سے بلند ہو کر ادا ابتدا و انتہا سے بے خبر ہو کر سب نے چاہا تھا۔ اور آہ کہہ چلنے کے لئے انہیں بہت سے چاہنے والوں کو خاک و خون میں تڑپتا دیکھنا پڑا، وہ جن کی ہر راحت انہیں عزیز تھی۔ ان کی لاشوں پر سے انہیں گزرتا پڑا۔ وہ جن کی

رفاقت انہیں محبوب تھی انہیں موت کے ہمراہ رخصت کرنا پڑا۔ وہ جن کی باتیں انہیں بے حد محبوب تھیں انہیں موت کی بھیانک خاموشیوں میں اپنے ہاتھوں دھکیلتا پڑا۔ اور پھر انہوں نے وہ خطہ امید پالیا جسکی تمنا میں اور جس کے لئے دعائیں ان کا شب و روز کا مشغلہ بن گیا تھا جس کے لئے وہ اپنے ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کئے بیٹھے تھے جس کے لئے وہ اپنے بڑے بڑے محبوبوں سے دست و گریبان ہوئے تھے جس کے لئے انہوں نے اپنے بڑے بڑے معززوں کی نگریاں اچھال دی تھیں جس کے لئے انہوں نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ کیا کچھ نہ دیا تھا۔

آج وہ اسی پر تمنا خطے میں ہیں جس کا مطلب وہ لالہ بتا یا کرتے تھے۔ اور یہ چاند اب انہیں ان کے نئے گھر میں دیکھنے آتا ہے۔ یہ چاند اب انہیں ان کے امیدوں کے محل میں مبارک باد کہنے کے لئے آتا ہے اور ساتھ ہی ان وعدوں کی فہرست بھی ہمراہ لاتا ہے جو انہوں نے اپنے رب سے بار بار کئے اور انہیں زمانے کے سینے پر کندہ کر دیا تھا جو انہوں نے وقت کی لوح پر اپنی اجتماعی آواز کے قلم سے لکھ دیئے تھے۔ یہ چاند انہیں وعدوں کی فہرست لے کر ان مسلمانوں کے پاس اب بھی ہر سال آتا رہتا ہے۔

اس سرزمین کا ایک ایک گھر اس پیغام سے آشنا ہے۔ سینے میں دھڑکنے والا ہر دل اس پیغام کی آواز کو اپنی دھڑکنوں میں سمویا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس سرزمین پر رہنے والا ہر ذی روح خون کے ان دریاؤں کے رُخ دیکھ چکا ہے۔ ان کی لہریں گن چکا ہے۔ ان طوفانوں کی گونج سن چکا ہے۔ ان زلزلوں کی گڑگڑاہٹ

محسوس کر چکا ہے۔ ان قیامتوں کی تباہی سے آشنا ہے۔ جو اس پر اس سرزمین کے حصول کے لئے برپا کئے گئے تھے۔ لیکن اس نے اپنے عزم کے فولاد سے ہر دھکے کا منہ موڑ دیا تھا۔ لیکن آج تک وہ اپنے اس خطمہ امید میں ان خوابوں کی تعبیر سے نا آشنا ہے جو اس نے ان تباہیوں کے اس پار دیکھے تھے جو اس نے افق کے کناروں پر، تمناؤں کی وادیوں میں روشن سایوں کی طرح جھلملاتے ہوئے پائے تھے۔ آخر آج وہ عید کے اس چاند کو کس نئے عذر سے ٹھال سکتا ہے؟ کیا اب یہ چاند نمانے کے سینے پر مسلمان کی نامسلمانی کی مہر ثبت کر دے گا؟ کیا اسے اب بھی مایوس ہی لوٹنا ہوگا؟ کیا اسے اس بات پر گواہی دینے پر مجبور کر دیا جائے گا کہ مسلمان اپنے رب سے باغی ہو چکا اور اس نے لالہ کی سرزمین میں نئے لات و سہل تراش لئے ہیں؟ آہ یہ تصور کتنا دلخراش ہے کہ اس تصور سے ہی زندگی کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں۔

یہ چاند عید کا یہ آبدار خنجر تو انہیں سپاہیوں کو مبارک باد دیتا ہے جو یہ عزم رکھتے ہوں کہ وہ اس ملک میں جو اسلام کے نام پر مسلمان کے خون سے خرید گیا تھا اور بہت گراں خرید گیا تھا، اسلام کا اقتدار قائم کریں گے۔ یہ خنجر تو انہیں کی بیٹیوں میں زیب دیتا ہے جو کفر کو کلیتہً ختم کرنے کے لئے ہتھیار بند ہو گئے ہوں۔ جنہوں نے عزم کر لیا ہے کہ جیسے انہوں نے باہر کے بوجہلوں اور یہ لہیوں سے نجات حاصل کی تھی ویسے ہی گھر کے منافقوں اور مفسدوں سے بھی نجات حاصل کریں گے۔ ان کا یہ فرض ہے کہ اس چاند کو مایوس نہ ہونے دیں۔

عید کا یہ چاند دیکھتا ہے کہ یہ ملک بھی غیر منقسم کافر ملک کی طرح ویسے ہی فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ عربانی سے خواری و افلاس کے نظارے ویسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر یہاں بھی عام ہیں۔ اسلام ویسے ہی یہاں بھی مجبور و سخیل و بے وقار ہے۔ ظلم و جور اور کفر ویسے ہی یہاں بھی برسرِ اقتدار ہے۔ یہ حیران ہو ہو کر جھک جھک کر دیکھتا ہے کہ کیا یہ وہی خطہ ہے جسے دیکھنے کے شوق میں وہ دار فتمہ پہنچا تھا۔ جس کے متعلق اس نے اپنے ہم نشینوں سے بہت بہت سرگوشیاں کی تھیں۔ اور جس کا چہرہ چا اس نے بزمِ انجم میں جا بجا کر رکھا تھا۔ اور جسے اس نے خطہٴ رحمت کا نام دینے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ کیا یہ وہی ملک ہے! اس کے لئے تو اسے پہچانتا بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔

وہ جھک جھک کر دیکھتا ہے لیکن اس جستجو کا کوئی نشانِ امید اسے یہاں موجود نظر نہیں آتا۔ اس کی تلاش کا یہاں کوئی حریف نہیں ہے۔ اس کی سرگوشیوں کا کوئی جواب دینے والا نہیں۔ اس کے سلام بے جواب واپس چلے جاتے ہیں۔ اس ملک میں کتنے ہیں جو اس کے خاموش سلاموں کا مفہوم سمجھتے ہوں اور کتنے ہیں جو اس کے سلام کا جواب دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ کتنے ہیں جو اس خدا کا قانون اس ملک میں جاری کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ جس کی وہ ایک نشانی ہے۔ کتنے ہیں جنہوں نے اس کشتی میں قدم رکھ دیا ہے۔ جو عزم و استقلال کے بادبانوں سے ہر اس طوفان کو نچاؤ کھانے کا حوصلہ رکھتی ہے جو راہِ حق میں رکاوٹ بننے کے لئے سامنے آئے۔

یہ چاند جھک جھک کر انہیں سلام کہہ رہا ہے۔ جنہوں نے خدا کی راہ

میں قدم اٹھا دیا ہے۔ جنہوں نے خدا کی رضا کے سامنے اپنی سپر ڈال دی ہے۔
 جنہوں نے طاغوتِ وقت سے لڑ جانے کے لئے کمریں کس لی ہیں۔ جنہوں نے
 ہر فرعون اور ہر نمرود سے کہہ دیا ہے کہ حق آ رہا ہے اور باطل جا رہا ہے
 اور باطل جانے ہی کی چیز ہے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ زمین ایسے مجاہدوں سے
 خالی نہیں ہے مسرت سے اس کا چہرہ چمک اٹھا ہے۔ رضائے الہی کے
 حصول کے لئے جو اپنا سب کچھ لگا دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ وہی ہیں جو
 اس کے سلام کا جواب دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔
 عیدِ کما یہ چاند ایسے ہر مجاہد کو سلام کہتا ہے۔



لاشوں کے انبار

اے لوگو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سب کچھ دیکھتے ہو اور خاموش رہتے ہو۔
 کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا تمہارا اسلام خطرے میں ہے آؤ ہماری طرف
 کہ ہم تمہیں ایک جنت میں لے چلیں جہاں ایمان کے باغات ہوں گے۔ ویسا
 اور عدل کے پھل ہوں گے اور اطاعتِ خداوندی کے زعفران سے ساری
 فضا مہک رہی ہوگی۔ تم ان کے پیچھے یوں لپک گئے جیسے ایک پالتو گھوڑا اپنے
 مالک کے ہاتھ میں ہری گھاس کی چند پتیاں دیکھ کر لپک پڑتا ہے۔
 اے لوگو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تمہاری عقلوں اور بصیرتوں کو دیک لگ
 گئی ہے۔

تم نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی کہ اپنی طرف بلائے والوں کے پھول
 کا غدی تھے۔ وہ خوبصورت تھے لیکن ان میں وفاداری اور ایقانے عہد کی
 خوشبو نہ تھی۔ ان کے اپنے طور و اطوار میں اسلام کے خادموں کا نہیں بلکہ
 کفر کے پیروؤں کا رنگ تھا۔ ان کی سیرت کی کھیتی میں ایمان کی زعفران نہ تھی۔
 ان کے اخلاق کے پانچوں میں اطاعتِ خداوندی کا ایک پودا بھی نہ تھا۔
 اے لوگو یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نے یہ سب کچھ دیکھا اور پھر بھی اپنی

گردنیں ان کے ہاتھوں میں دے دیں اور چپ چاپ ان کے اقتدار کی گاڑی میں جیت گئے۔

یہ تم کہاں بھکے چلے جا رہے ہو۔

تم نے جن لوگوں کے وعدوں کی کھیتی اپنے خون سے سینچی تھی کہ وہاں اسلام کا پودا اُگے گا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اس بجز زمین میں کیا اُگا۔

یہ اسلامی سوشلزم کی خود رو جھاڑیاں، اسلامی اشتراکیت، گنے تھار دارنوں سے مغربی جمہوریت کی مکروہ گھاس ... بے دینی و الحاد کے کاٹے اور فتنے

ثقافت کے جھاڑ جھنکار کے سوا وہاں کچھ بھی نہ اُگ سکا۔ تمہارے خون کے معاوضے میں تمہیں اللہ کی نعرہ شنودی سے محروم کر دیا گیا اور شیطان کے غلیظ

سہاں تمہارے چاروں طرف بکھیر دیئے گئے۔ لیکن تم ہو کہ دم بخود پڑے ہو یا یہ کیا ہے کہ تمہارے احساس ایمانی کی ساری رگیں کٹ گئی ہیں۔

ایک شخص ملک کے ایک گوشے سے دوڑا ہوا آیا اور اس نے سر ہاتھ

چینچ چینچ کر کہا کہ "اے لوگو اپنے رب کی طرف آؤ کہ وہی تمہارا مالک و خالق ہے۔

اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ اسی کا قانون تمہاری زندگی کا قانون بننا

چاہیے۔ یہ مغربی سیاست کے بت جو تم نے تراش رکھے ہیں یہ تمہیں کہیں کمانا

چھوڑیں گے۔ اگر تمہارے اگلوں نے غلطی کی تو کیا تم بھی اسی غلط راہ پر گروں

جھکائے بگٹ چلے جاؤ گے۔ آؤ اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔"

کنے والا کہتا رہا لیکن تم نے بے حسنی کے پینے اپنے کانوں میں دنتے لئے

اور نا سمجھی کی ہٹی باندھے تم اپنے خدا کی مرضی سے دور ہٹ گئے۔

اے لوگو! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ہر راہ پر چل پڑتے ہو اور ایک خدا کی راہ ہی ہے جس پر تمہارے پاؤں من من بو جھل ہو جاتے ہیں۔

کیا تم اپنا فرض کبھی نہ پہچانو گے؟ کیا تم یونہی خدا کی نافرمانی کی سڑک پر ہنوار کرنے والے مزدور بنے رہو گے؟ کیا حق کی منطلو متیت تمہارے سینوں کو کبھی نہ گرمائے گی؟ کیا باطل کی شوکت کی گاڑی میں تم یونہی جتے رہو گے؟۔ خدا کے بندو کیا تم بھول گئے ہو کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان صرف اللہ کا کلمہ ہی بلند کرنے کے لئے اس دنیا میں آیا ہے۔ اے لوگو! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کے باغی تمہارے کندھوں پر سوار ہیں اور تمہارے سینوں میں ایک ٹپس بھی بیدار نہیں ہوتی۔ کیا تم یونہی لاشوں کی طرح پڑے رہو گے یہاں تک کہ اٹپس تمہیں اٹھا کر اپنے فرائض میں ڈال لے۔ اللہ کے بندو تم تو بالکل ہی لاشوں کے اتبار بن کر رہ گئے ہو۔



زندگی کا تقاضا

”مٹی سے ہم پیدا ہوئے ہیں۔ مٹی ہی میں ہمیں لوٹ کر جانا ہے اور مٹی سے
 ہی ہم دوبارہ اٹھائے جاتے ہیں گے۔ ہر ذی روح کی موت اپنے سمجھے زندگی
 کے لئے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے۔ ”تمہاری باری بھی مقرر ہے۔ ہر جزا کو گویا
 زبان حال سے یہ کہہ کر گند جاتا ہے۔ ”تمہیں بھی ایک دن اسی راہ پر آنا ہے۔“
 ہر مرنے والا اپنی ساکت زبان سے یہ کہہ کر منوں مٹی میں رو پوش ہو جاتا ہے
 اور دنیا کے واشگواف حقائق میں سب سے بڑی حقیقت اگر کوئی ہے تو یہ ہے
 کہ ہر زندگی کا فطری تقاضا موت ہے۔ یہ بات اتنی ہی معقول ہے جتنا دواور
 دوچار ہونا معقول ہے۔ یعنی والا اپنی زندگی کی شاہراہ پر اعمال کی ایک طویل
 فہرست مرتب کرتا ہوا چلتا ہے اور جب وہ دنیا کے اس دائرے
 میں اپنا ناری لباس چھوڑ کر کسی دوسرے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔
 تو اس کے اعمال کی اچھائی اور برائی اس کے افعال کا حسن و قبح، اس کی نیکیاں
 اور بدیاں، اس کا ظلم اور اس کی ہمدردی، اس کا انصاف اور اس کی بے دردی
 اس کا رحم اور اس کی بے رحمی، اس کے وہ کارنامے جنہوں نے مخلوق کو ہدایت
 کی طرف بلا یا اور اس کی وہ حرکات جنہوں نے مخلوق خدا کو قہر اور جبر اور ظلم و طغیان

میں مبتلا کیا۔ یہ سب مل کر تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے نتائج بھی مترتب ہوں۔ گزرنے والا تو شاہراہِ زندگی پر پھول اور کانٹے بکھیرتا ہوا گزر گیا۔ لیکن ان پھولوں اور کانٹوں کا ایک پوشیدہ تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اسے ان اچھائیوں پر انعام ملے جنہوں نے بشمار انسانوں کو فیض پہنچایا۔ لیکن اس دنیا کے بڑے بڑے مادی آسائش کے سامان بھی اس قابل نہیں ہیں کہ اس کی اچھائیوں کا کما حقہ معاوضہ ہو سکیں۔ ان برائیوں پر سزا ملے جنہوں نے بشمار انسانوں کو مدت تک مبتلا کیے عذاب رکھا اور جن کے اثرات ان کی آئندہ نسلوں تک بھی پھیل گئے۔ لیکن دنیا کے مادی ذرائع کا بڑے سے بڑا عذاب اور دکھ بھی اس کی ایسی برائیوں کا کما حقہ بدلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایک سلیم الطبع انسان کی نظرت خود یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہو۔ اور مسلمان کا ایمان بھی یہی کہتا ہے کہ ہاں اس موت کے دروازے میں سے گذر کر جہاں دنیاوی زندگی کا یہ مسافر جاتا ہے۔ وہاں ایک زندگی اور بھی ہے اور وہ زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے۔ موجودہ زندگی اس زندگی کی کھپتی ہے۔ یہ عمل کی جگہ ہے اور وہ اس کے نتائج بھگتنے کی۔ یہ عالم عمل ہے تو وہ عالم جزا ہے۔ یہ بونے کی جگہ ہے تو وہ فصل کاٹنے کی۔ یہاں امتحان دیا جاتا ہے تو وہاں نتیجہ نکلتا ہے۔ مسلمان کا یہ ایمانِ آخرت ہی ہے جو اس کے سامنے اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کی ایک معین راہ کھولتا ہے اور یہی معین راستہ یا نظامِ حیات ہے جو اسے دوسری تمام قوموں سے ممتاز اور نمایاں کرتا ہے۔ مسلمان اس آخری بہتری کے لئے یہاں کوشش کرتا ہے۔ عہد و جہد کرتا ہے

اور تداپیر و ذرائع کام میں لاتا ہے۔ مسلمان انفسرادی اور اجتماعی طور پر شعوری اور غیر شعوری ہر حالت میں یہ تصور ضرور اپنے ذہن میں رکھتا ہے کہ اسے ایک روز مرنانا ہے اور پھر اسے ان اعمال کی جواب دہی کرنی پڑ جائے گی۔ جو وہ اس دنیا میں کر رہا ہے، ایک گمراہ سے گمراہ اور ایک فاسق سے فاسق مسلمان بھی اس تصور کو نہیں بھلا سکتا۔ یہ تصور اس کی گھنٹیوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ کہ یہ زندگی اپنے ساتھ ایک پوشیدہ تقاضا رکھتی ہے اور اس تقاضے کے نتیجے میں ہی زندگی اور کائنات کا پوشیدہ راز کھل کر سامنے آئے گا۔



آزادی کا ماتم،

پندرہ اگست یہ وہی دن ہے جب ہماری آزادی نے جنم لیا تھا۔
 اور اس کی ولادت کے درد سے پوری قوم کی چھین نکل گئی تھیں۔ اسی پندرہ
 اگست کی خونیں تصویر، جو یہاں صفحہ قرطاس پر کھینچی جا رہی ہے تاکہ سندرہ ہے
 اور آنے والی نسلوں کے کام آئے۔ یہ وہ دن ہے جب موت کی ساری
 ہلاکتیں اور خوف ناکیاں زندگی کی ساری راحتوں اور شگفتگیوں کے خلاف
 صاف آرا ہو گئی تھیں۔ جب انسانی ضمیر کی ساری نقاست اور پاکیزگی
 پر شیطانی فکر کی ساری خباثت اور غلاطت نے ہلہ بول دیا تھا۔ جب موت
 اپنے سیاہ پروں کے ساتھ گھر گھر پر پرواز کرتی فرد فرد کے سر پر منڈلائی اور
 نفس نفس کو اپنے شکار کے لئے تاکتی تھی۔ جب ضمیر انسانیت زخموں سے
 خونچکاں ہو گیا تھا اور بہیمت و حیوانیت کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ جب برصغیر
 کی آزادی سے انسانوں کی بربادی نے جنم لیا تھا۔ جب پتہ چلا تھا کہ یہ
 برصغیر جسے اپنی مشرقی شرافت پر ناز تھا۔ ایک کچھار تھا جس میں درندوں کی
 فوجیں فرنگی کی سنگینوں تلے مجبوس پڑی تھیں اور غلامی کا بند ٹوٹتے ہی وہ درندے
 اپنے کھلے جہڑے لئے اپنے تیز پنجوں۔ خوفناک آنکھوں اور اپنی ساری

خونخواری اور خون آشامی کے ساتھ انسانیت کے جسدِ ضعیف سے چمٹ گئے تھے۔ اسے چبا ڈالا تھا۔ اسے پھینچوڑ ڈالا تھا۔ اس کے پر خچے اڑا دیئے تھے اور اسے کچا چبا گئے تھے۔

یہ پندرہ اگست ہے۔ یہ وہی دن ہے جب کڑوا کر ارض پر ابلیس نے اپنے ایجنٹ کھلے چھوڑ دیئے تھے اور ان کے منصوبے عالم وجود میں آئے تھے۔ جب عفریتوں نے ہلاکت آفرینی کا ننگا تاج ناجا تھا جب ابن آدم نے ابن آدم کے خون سے ہولی کھلی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سر ٹھوکروں سے اڑائے تھے۔ جب کھوپڑیوں سے فتح کے مینار بنائے تھے۔ بوٹیاں اچھالی تھیں۔ لوہڑے بکھیرے تھے۔ ہڈیوں کے اتبار لگائے تھے۔ سرد فولاد نے انسانیت کے جسم سے ساری گرمی اور حرارت چوس لی تھی۔ گرم بارود شرافت کی ساری خشکی کھا گیا تھا۔ تیز و تند آگ نے کمزوری اور مظلومیت کی ہر رگ جلادی تھی۔ جب ڈاکوؤں کی تلواروں نے کہہ دیا تھا کہ راج اور حکومت سب کچھ ہمارا ہے۔ جب برچھپوں نے کہا تھا کہ حکم ہمارا ماننا جاتے گا۔ جب گولیوں نے سنا سنا کر سنا دیا تھا کہ شاہی پوری کی پوری ہمارے لئے ہے۔ جب لاشیوں کی فوجیں نکل آئی تھیں اور نیزوں کے دستے صف آرا ہو گئے تھے۔ جب کرپانوں کے عول امنڈ آئے تھے اور جب بندو قوں کی صفیں بندھ گئی تھیں۔ جب تیروں کی پلٹنیں میدان میں آگئیں تھیں اور توپوں کے رسالے اہل پڑے تھے اور تن تنہا انسانیت پر

پوش کر دی تھی۔ جب شورشِ گویا تھا کہ یہ ہندو ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ یہ سکھ ہے۔
 آہ۔ اس کا رزار میں بہت ہندو تھے۔ بہت سکھ تھے اور بہت مسلمان تھے۔ لیکن
 ایک بھی انسان نہ تھا۔ انسانیت اس دن سرپیٹ چکی تھی۔ شرافت اس دن
 دم توڑ چکی تھی۔ خدا خونی اس دن مرگ بے ہنگام کا شکار ہو گئی تھی۔ رحم اس
 دن تڑپ تڑپ کر چلی بسا تھا۔ ہمدردی کے لئے اس دن کوئی جاسے
 پناہ نہ تھی۔ انصاف اس دن دھواں بن کر اڑ گیا تھا اور اخلاقی پاکیزگی
 کے اس دن پر خلتے تھے، آف وہ کیسا دن تھا، کیسے لمحے تھے۔ وہ کسی گھڑیا
 تھیں۔ جب بوڑھے بڑے صغیر نے اپنا جشنِ آزادی منایا تھا۔ جب نومولود
 ارضِ پاک نے ہاتھ پاؤں مارے تھے۔ مورخ کو اس دن ایک انسان بھی
 نظر نہ آتا تھا جس کے نام سے وہ اپنی تاریخ کے اس خونیں بابِ آزادی
 کا افتتاح کر سکے۔ اسے درندوں کے ایک جنگل کی تاریخ مرتب کرنی پڑ گئی
 تھی۔ جہاں مار دھاڑ، چیخ و پکار اور آگ و خون کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی
 تھی۔ نہ کسی وجہ کا دہاں دخل تھا۔ نہ کسی سبب کی دہاں چلتی تھی، نہ کسی وسیلے
 کی دہاں شنوائی تھی۔ بس ایک دیوانگی کا رقص تھا۔ ایک خونخواری کا سیل تھا
 ایک جیوانیت کا طوفان تھا۔ ایک خون آشامی کا لاوا تھا۔ ایک تباہی و بربادی
 اور تاراجی و جہاں سوزی کا ریلہ تھا۔ مورخ بے بس تھا۔ اس کی انگلیاں زخمی تھیں
 اس کا قلم خونچکاں تھا اور اس کی سیاہی خون ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صرف اتنا کہہ
 سکا: "جب بڑے صغیر آزاد ہوا تو اس میں کوئی انسان نہ رہتا تھا۔"
 یہ پندرہ اگست ہے۔ یہ وہ دن ہے جب آزاد قوموں کی طویل فہرست

میں اس بڑے صغیر کا نام بھی لکھا گیا تھا۔ وہ آزاد قومیں جن کی آزادی دیوانے کتوں
 کی آزادی ہے۔ جو اگر قوی ہیں تو انصاف و عدل کا لفظ ان کی لغت میں نہیں
 اور کھل و بر و باری کا ان سے علاقہ نہیں۔ جو دنیا کے کونے کونے میں
 مست ہاتھی کی طرح سونڈ اٹھاتے پھرتی ہیں۔ تاکہ ہر کمرہ و رکنا خون آزادی
 پیوس لیں۔ ہر آزاد کو محکوم بنالیں۔ ہر ضعیف کو تنگ لیں۔ ہر بے بس کو چاڑھ لیں
 ہر پست کو کچل ڈالیں۔ ہر ذی روح کو اپنی مالکانہ حفاظت میں لے لیں اور
 ہر ذرے کو اپنا خادم بنالیں۔ وہ آزاد قومیں جو اگر قوی ہیں تو اپنے مسائل
 کے طریقوں کے بل پر دنیا کا چہ چہ اپنا باج گزار بنا لینا چاہتی ہیں۔ جو ہر
 درخت پر اپنی چہر کردینا چاہتی ہیں تاکہ کوئی بھوکا ان کا ایک پھل بھی بلانہ
 نہ کھا سکے۔ کوئی خانماں برباد ٹیکس ادا کئے بغیر کسی سامنے نہ بیٹھ سکے
 کوئی پرندہ کسی سرسبز درخت کی شاخوں پر آزادی سے بسیرا نہ کر سکے جو ہر
 صحرا کو محیط کر لینا چاہتی ہیں۔ جو ہر چہرند پرند اور انسان کے گلے میں اپنی
 غلامی کا تمغہ لٹکا دینا چاہتی ہیں۔ وہ آزاد قومیں جو اگر قوی ہوں تو ہر صحرا
 اور جنگل ان کا ہے۔ ہر جزیرہ اور جزیرہ نما ان کا ہے۔ ہر پہاڑ اور ہر دریا
 ان کا ہے۔ ہر ملک۔ صوبہ اور ضلع ان کا ہے۔ ہر شہر اور ہر جونا گڑھ ان
 کا ہے۔ ہر بھوپال اور ہر خدیو آباد ان کا ہے۔ وہ آزاد قومیں جو اگر قوی
 ہوں تو سب سے بڑی مقصد وہ ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ ظالم وہ ہوتی
 ہیں۔ سب سے بڑھ کر خونخوار وہ ہوتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر جابر اور قہران
 اور خون آشام وہ ہوتی ہیں۔ وہ کمرہ و رکنا کو تنگ جاتی ہیں۔ وہ بے کسوں کو عالم

چبالیتی ہیں۔ وہ بے اختیاروں کو مضہم کر جاتی ہیں۔ ہر فساد جن کا خادم ہے۔ ہر ظلم جن کا پیش خدمت ہے۔ ہر تباہی جن کی لوندی ہے۔ ہر بے انصافی جنکی۔ غلام ہے۔ ہر کرد و فریب جن کا خانہ زاد ہے۔ آج کے دن انہیں آزاد قوموں میں بڑے صغیر کا نام بھی لکھا گیا تھا۔ تاکہ دنیا کے فسادات میں جو کمی ہے وہ پوری کر دے۔ بنی نوع انسان کے دکھوں میں جو کسر ہے وہ نکال دے۔ زمین کے جو نچلے خون کے چھڑ کا ڈسے محروم ہیں انہیں سیراب کر دے۔ جو کراہ تک نہ ہو سکے تھے انہیں وجود میں لے آئے۔ جو فساد اب تک نہ اٹھائے جاسکے تھے انہیں اٹھا کھڑا کرے۔ جو ظلم اب تک نہ کٹے جاسکے تھے وہ کر کے دکھائے۔ جو تباہی دنیا اب تک نہ دیکھ سکی تھی اسے بلا دیا بھیج دے اور وہ مبارک دن یہی پندرہ اگست تھا۔

یہ پندرہ اگست ہے۔ آج عفریتوں نے کہا تھا کہ آؤ مل کر جشن آزادی منائیں! آج تباہیوں نے بڑے صغیر کو آزادی کا بدیہ تبریک پیش کیا تھا۔ آج ہلاکتوں نے دل کھول کر خون کے خم کے خم لندھاٹے تھے۔ آج بلاؤں نے کہا تھا کہ وقت کی نبض ہمارے لہتے ہیں ہے۔ آج راون نے کہا تھا کہ اس ملک کی ہر سیتا میرے تصرف میں ہے۔ آج دریودھن نے کہا تھا کہ میں اس ملک کی ہر روپیہ کو عریاں کر کے نہ ہوں گا۔ آج فرعون نے کہا تھا کہ میری تلوار کی دھار اس ملک کے ہر بچے کی گردن پر آزمائی جائے گی۔ آج ہلاکتوں نے کہا تھا کہ کوئی بوڑھا میرے وار سے بچ نہ سکے گا۔ آج چنگیز نے کہا تھا کہ

ہر ضعیف میرے سامنے ذبح ہوگا۔ آج شہادت کے کہا تھا کہ ہر عورت میرے
 سیم کا نشانہ ہوگی۔ آج موت کے خونیں دھارے زندگی کی ہر گ سے
 پھوٹ پھسے تھے۔ آج خون کی آبتاریں ہر فرار سے بہہ نکلی تھیں آج تاریخ
 کی صدیوں کی گہری جڑیں اکھڑ گئی تھیں۔ آج وقت کا پہلیہ الساحل نکلا تھا
 شمال مغرب سے آنے والے قافلے آج پھر شمال مغرب کی طرف اٹھ چلے
 تھے۔ مستقل باسی آج پھر مسافریں گئے تھے۔ نہ مکان رہے تھے۔ نہ زمین
 رہی تھیں۔ نہ ملکیتیں۔ نہ رشتے رہے تھے۔ نہ دشمنیاں اور دوستیاں
 رہی تھیں۔ نہ عقیدت اور دعوے رہے تھے۔ نہ اپنے اور بیگنے رہے
 تھے۔ آدم کے فرزندوں کو پھر ان کی جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیا
 گیا تھا۔ آزادی کا یہ سب سے پہلا ٹخفہ تھا جو انہوں نے اس ملک سے پایا
 تھا۔ سر بلندی کا یہ سب سے پہلا سرٹیفکیٹ تھا جو انہوں نے اپنی قیادت
 سے حاصل کیا تھا۔ جس قیادت کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سروں
 پر بٹھایا تھا وہ انہیں موت کی وادیوں میں چھوڑ کر ہوا کے دوش پر سوار
 سرحدوں کے پار جا بیٹھی تھی۔ جن کے لئے نعرے لگاتے لگاتے ان کا حلق
 خشک ہو گیا تھا۔ وہ ان کی گردنوں پر چھریاں رکھ کر خود فرار ہو گئے تھے
 جن کے فخر اقدار انہوں نے اپنے ووٹوں کی اینیٹوں سے تعمیر کئے
 تھے۔ وہ انہیں پھانسی کے تختوں پر چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے اور
 انہیں ایک طویل تجربے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ جس سگے کی کھنک پر
 وہ اتنے مسرور تھے وہ تو ضرورت کی منڈی میں بالکل ہی کھوٹا نکل گیا تھا

یہ نپدرہ اگست ہے۔ آج ایک قوم کو اچانک میدانِ آزمائش میں دھکیل دیا گیا تھا۔ آج اس قوم کو جس نے برسوں سے شور مچا رکھا تھا کہ ہم نے اپنا آموختہ یاد کر لیا ہے۔ اچانک اپنا سبق سنانے کے لئے کہہ دیا گیا تھا۔ ایک اس طالب علم کو امتحان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جو مدت سے اپنی قابلیت اور اہلیت کا ایشٹہار دینے والا تھا۔ آج اچانک اس تلاش کے دامن میں ایک بھاری امانت ڈال دی گئی تھی جس نے برسوں سے اپنی دیانت داری کا اعلان کر رکھا تھا۔ آج ایک اس کشتی کے پتو اور ان ناخداؤں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیوں سے جہنوں نے مدت سے شور مچا رکھا تھا۔ کہ ان کی منزل مقصود مدینہ ہے۔ جن کی نہ باتوں پر اسلام کا لفظ بار بار آتا تھا۔ جن کے حلق اسلامی نظام کے نعروں سے خشک رہتے تھے۔ جنہوں نے گلی گلی وعدے بکھیر رکھے تھے۔ جنہوں نے کوچہ کوچہ اپنے عہد و پیمانے کا اعلان کر رکھا تھا۔ جنہوں نے اسلام کو ایک فریقِ جنگ بنا رکھا تھا۔ آج کے دن ایک ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ آؤ اور امتحان گاہِ زمانہ میں اپنے وعدوں کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے لاؤ۔ آج کا دن آزمائش گاہ میں داخلے کا پہلا دن تھا۔ اور اس داخلے کے لئے قوم نے کتنی بھاری فیس ادا کی تھی۔ قوم کے نصف کو گروی رکھا گیا تھا۔ قوم نے اپنے معصوموں کی مسکراہٹوں کو بیچا تھا۔ اپنے بوڑھوں کے وقار کو نیا م کیا تھا۔ اپنے جوانوں کی خودداری اور قوت بھینٹ چڑھائی تھی۔ اپنی عزتوں اور عصمتوں کے موتی لٹائے تھے۔ اپنی تاریخ کا ہر سالہ ریکارڈ کھاڑ خانے کی نذر کیا

تھا۔ اپنے مردوں کے ڈھانچے اکھڑوائے تھے۔ اپنے زندوں کے لاشے
 ڈھیروں ڈھیر دٹیے تھے۔ اپنی مساجد کا سہاگ لٹایا تھا۔ اپنے میناروں
 کو وقفِ ماتم کیا تھا۔ اپنی نصفِ ملی روح بھی تھی۔ تب اسے یہ واقعہ
 ملا تھا کہ وہ آگر اپنے وعدوں کا امتحان دے۔ اس امتحان کا نتیجہ آج
 تک زمانے کے سینے پر نمودار نہیں ہوا۔ شاید یہ سب کچھ ہی راوی اور بیال
 کے خواتین پانی میں بہ گیا۔

یہ پندرہ اگست ہے۔ نیرون دانتوں میں انگلی لئے حیران و متعجب کھڑا
 ہے۔ کہ یہ قوم جو اپنے محبوب نصیب العین کے لئے غلامی کی حالت میں
 بھی اپنے وجودِ معنوی و مادی کو قربانی کے تختے پر لئے کھڑی تھی، آج آزاد
 کی حالت میں اس محبوب کی طرف سے اتنی بے حس کیوں ہے؟ جو غلامی
 کے قفس میں اس کے بغیر تڑپتی تھی۔ اب آزاد ہو کر اس سے کیوں غافل
 ہو گئی ہے۔ جس مسافر نے رات کی تاریکیوں میں منزل مقصود تک پہنچنے
 کے لئے سرٹخ بیٹخ دیا تھا، اب طلوعِ صبح پر منزل کی طرف سے بے خبر
 دنیا کے دورا ہے پر کیوں سو یا پڑا ہے؟

یہ کیسا عجیب ہے جس نے تلوار کے حصول کے لئے دن رات ایک کرتے
 اور جب تلوار حاصل ہو گئی تو میدانِ جہاد سے فرار کی تیاریاں کر رہا ہے
 یہ کیسا عشق ہے جو محبوب کے کوچے میں آ کر ہی سرو ہو گیا ہے۔ یہ کیسا جوشِ جہاد
 ہے جو ہتھیار لٹے ہی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ پندرہ اگست کا دن حیران و نشہ

کھڑا ہے اور دیکھتا ہے کہ جس راہ کے کاٹے اس مسافر کے لئے پھول
تھے۔ اس راہ کے پھول چننے کے لئے اس مسافر نے ایک قدم بھی
نہیں اٹھایا۔ حقیقت کی اس تلخ تعبیر پر اسے سکھتا سا ہو گیا ہے۔

یہ بندرہ گنت کا دن ہے۔ یہ دن واگہ پار کے باشندوں کو
یاد دلاتا ہے کہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ٹکڑے۔ تم نے دعویٰ کئے
تھے کہ یہاں کے باشندے سب ایک ہی قوم ہیں۔ اس اصول کا دور دور تک
ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ اس کے لئے ایک پوری تحریک چلائی تھی اور نصف
صدی تک تمہارے بہترین افراد اس اصول کا اعلان اپنی زندگی اور اپنی
موت کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ تم اس اصول پر ایمان رکھتے تھے اور اس
ایمان سے ہٹ جانا تمہارے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن حالات کے ایک
پلٹنے کے ساتھ ہی تم نے اپنے اس محبوب اصول کو یوں پھینک دیا۔
کوئی بچہ اپنا ٹوٹا ہوا کھلونا پھینک دیتا ہے۔

تم نے اپنے عمل سے۔ اپنی زبان سے۔ اپنی تلوار سے۔ بندو قوں
سے۔ برکھپوں، تیزیوں اور بھالوں کی زبان سے کہلوایا کہ جن لوگوں کو
تم اصولی طور پر اپنی قوم کا ایک جزو کہتے تھے۔ حقیقت میں تمہارے
دل اپنے اس اصول کو خود جھٹلاتے تھے۔ تم نے ان کی عزتیں لوٹیں
ان کے گھر لوٹے۔ ان کو تباہ و برباد کیا، ان کا خون پانی سمجھ کر بہا دیا۔ حالانکہ
کوئی قوم اپنی قوم کے افراد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتی۔ یہ دن تم

سے کہنے آیا ہے کہ تم جھوٹے تھے اور تم نے نصف صدی تک جس بات پر ایمان رکھا اسے ایک دن میں... غلط ثابت کر دیا۔ آزادی کی جس تلوار کو تم ملک کے ہر طبقے کے لئے رحمت کہا کرتے تھے اسے پائے ہی تم کمزوروں کو ذبح کرنے کے لئے لپک پڑے تاکہ سب سے پہلے اس کی تیزی انہیں پر آزماؤ۔ جو آزادی تم انسانیت کے فروغ اور اچھائی اور بھلائی کی اشاعت کے لئے لینا چاہتے تھے۔ وہ آزادی تم نے انسان کشی اور مردم آزادی پر استعمال کی۔ تم میں جو بین الاقوامیت کے علمبردار تھے وہ اول درجہ کے فرقہ پرست نکلے تم میں جو اتحاد کے بڑے دعویدار تھے وہ اول درجہ کے فساد اور موذی نکلے۔ تم نے بہت جلد پوری دنیا کے سامنے یہ شہادت دے دی کہ سیاسی آزادی نے ایک انسان کے بند غلامی نہیں کھولے بلکہ ایک وزندے کا پنجرہ کھول دیا ہے۔ آج کا یہ دن برصغیر کے لوگوں کو یاد دلاتا ہے کہ ان کی آزادی کا مقصد خلق آزادی نہیں بلکہ خلق پروری تھا۔ تعصب کا فروغ نہیں بلکہ اس کا خاتمہ تھا۔ یہ دن ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ زندگی کو چھوڑ دیں اور انسانیت کو ابھاریں، اور دنیا کے ممالک میں ایک بہتر بااخلاق صلح پسند ملک کا اضافہ کریں۔ وہ رام کا وطن ہے جو عہد کا پکا تھا۔ وہ لکھنؤ کا وطن ہے جو اپنے بھائی کا بہت خیر خواہ تھا۔ وہ گوتم کا وطن ہے جو ظلم نہیں کرتا تھا۔ وہ کرشن کا وطن ہے جو سدا جا جیسے عزیز دوست کی عزت افزائی کر سکتا تھا۔ اور جس کا پیغام ظلم کی مخالفت اور حق کی

حمایت تھا۔ وہ اشوک کا وطن ہے جو طاقت کے باوجود رحمدل تھا۔ وہ ارجن
 کا وطن ہے جو فراخ دل تھا۔ کیا اب وہ ان لوگوں کا ملک بن جائے گا
 جو دنیا کے سامنے اور تاریخ کے صفحات میں بے گناہوں کو قتل کرنے
 والے، کمزوروں پر ظلم کرنے والے، بے اختیاروں پر بے جا اختیار
 استعمال کرنے والے، بچوں پر ہاتھ اٹھانے والے، عورتوں اور بزرگوں
 کو ذلیل کرنے والے ٹھہرائے جائیں گے۔ اگر وہ اپنے ملک کو یوں
 بنانا چاہتے ہیں تو یہ آزادی کا دین ان کی اس آزادی پر ماتم کرتا ہے۔



راکھ کے ڈھیر

ناخدا ترسی۔ بے نقیبی اور مادہ پرستی نے ابن آدم کو کیا سے کیا بنا دیا

باکھل راکھ کے ڈھیر!

نفرت۔ بغض۔ عداوت۔ جنگ و جدل۔ تباہی اور بربادی اس کے

روزمرہ کے معمول بن گئے ہیں۔

آہ کوئی ان بے جان راکھ کے ڈھیروں اور بھڑکتی ہوئی چٹانوں کو

دیکھے جو انسانوں نے اپنے کمالِ انسانیت کے مظاہرے کے طور پر

بھڑکائی ہیں۔ جن کی تہ میں چھلے ہوئے ڈھانچے، اجل گرفتہ اجسام اور

تباہ شدہ انسانیت کے اعضاء مدفون ہیں۔ یہ وہ تحفے ہیں جو ہمسایوں

نے ہمسایوں کو۔ بھائیوں نے بھائیوں کو اور دوستوں نے دوستوں کو

پیش کئے ہیں۔ درگاہِ انسانیت میں یہ کتنے بیش بہا تحائف ہیں۔ بربادی

بے چارگی۔ زخم۔ آہیں اور عنیض و عنیب۔ یہ بیش بہا تحائف مادہ پرستی

اور ناخدا ترسی دورِ حاضر کے ابن آدم کے حضور میں لائی ہے۔

آہ: کوئی ان چلتے پھرتے راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے، جن کے نیچے

شرافت و انسانی ہمدردی، اخلاق اور خدا خوفی، سوختہ حالت میں مدفن
 ہیں جن کے سینوں میں بغض و عداوت، اخلاقی پستی ظلم اور ناخدا ترسی
 کی چنگاریاں شعلہ رہی ہیں۔ بستیاں جن کے گتھیف شعلوں سے الامان و الحفظ
 پکار اٹھی ہیں۔ ہلاکت و درندگی جن کے تپتے ہوئے سینوں میں سانس لے
 رہی ہیں، طیفوں اور فرقوں کی عداوتوں نے انہیں جہنم کی بھٹیاں بنا دیا
 ہے اور تباہی و بربادی ان کی رفیق ہیں۔ نہ یتیم کے آنسو ان کی آنکھوں
 میں نمی پیدا کر سکتے ہیں۔ نہ بیواؤں کی آہیں ان کے دلوں کی تپش بجھا سکتی
 ہیں۔ نہ مظلوموں کی آہ و زاری ان کے دلوں میں عبرت کی لہر دوڑاتی ہے۔
 اور نہ ضعیفوں کی بے چارگی ان کے مہلک ارادوں کو تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ
 انسان کہلانے والے دوپائے چلتے پھرتے راگھ کے ڈھیر ہیں جو اپنی دم
 کی ہر صفت سے عاری ہیں۔

آہ کوئی ان راگھ کے ڈھیروں کو دیکھے جن کے سینوں کی چنگاری
 نے قوموں کو بھون دیا ہے جن کی سانسوں میں تنور کی لپٹیں ہیں جن کے
 الفاظ آتشیں تیر ہیں جو دنیا کی قیادت کی شہ نشینوں پر بیٹھ کر دنیا کے
 اطراف و جوارب میں امن و سلامتی کی بجائے آگ چھڑکتے ہیں جو ارضی
 جہنموں کے واروغے ہیں جن کے صوفوں کی نرمی میں کسی بے گناہ کی
 ٹوٹی ہوئی ہڈی بھی کمی نہیں کر سکتی۔ جن کی کاروں کی رفتار کو لڑھکتا ہوا
 لہر بھی مست نہیں کر سکتا۔ جن کی سو فٹ ناک آتشیں تقریروں اور بیانیوں

کی تلخی کو کسی بے گناہ کی پیچ کسی مظلوم کا نالہ۔ کسی بے بس کی پکار اور کسی معصوم کی آہ بھی بدل نہیں سکتی۔ جن کے دلوں میں جہنم کی آگ کی لپٹیں ہیں جن کا تختِ طاؤس انسانی کھوپڑیوں پر کھڑا ہوتا ہے اور جن کا راہوار انسانی خون میں تیرنا پسند کرتا ہے۔ جن کا وقار ہر آہ۔ تڑپ اور ٹہس کے احساں سے بلند ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے یوں بھڑواتے ہیں جیسے روم کے قیصر درندوں سے بھڑوایا کرتے تھے جو اپنی راہنمائی میں نیرو اور پلا کو ہیں۔

آہ کوئی راگھ کے ان ڈھیروں کو دیکھے جو شہداء علی الناس کا خطاب پا کر اس دنیا میں آئے تھے جو فساد فی الارض کو دور کرنے والے گردانے گئے تھے۔ جو انسانوں کو انسانیت۔ ہمسایوں کو ہمسائیگی۔ دوستوں کو دوستی بھائیوں کو اخوت اور والدین کو شفقت و رحمت سکھانے آئے تھے۔ جو دنیا میں انسانی کا نمونہ بن کر آئے تھے۔ دیانت اور سچائی جن کی نصلت تھی۔ رحم اور ہمدردی جن کی فطرت تھی۔ محبت و یگانگت جن کے ہمین و لیسا رہتی تھیں۔ اور عدل و انصاف جن کی گھٹی میں ڈالے گئے تھے جو ابن آدم کو گمراہی کی ہلاکتوں سے نجات دینے آئے تھے۔ ان کے گمراہ سروں کو ہرزکت و مسکنت سے اٹھا کر ایک ہی درگاہِ عالی میں جھکانے آئے تھے جو نسلِ خون کے ماروں کو۔ قوم و وطن کے ہلاکت زدوں کو۔ آبا و اجداد کے پامالوں کو اور اولاد کے پستاروں کو۔ ان تمام ذلیل کن بھندوں سے

نکال کر ایک بلند انسانی سطح پر بٹھانے آئے تھے۔ ہاں کوئی ان راہ کے ڈھیروں کو دیکھے جن کے پاؤں اب ہر ایسی زنجیر میں گرفتار ہیں جن سے انہوں نے بنی نوع انسان کو چھڑایا تھا۔ جو فساد کو مٹانے آئے تھے وہ سر سے پائیک فساد میں لپھٹا گئے ہیں جو نسل و خون اور قوم و وطن کی بندگی سے دوسروں کو چھڑانے آئے تھے۔ وہ خود ہلاکِ جادو سے سامری اور قاتلِ شیوہ آذری ہیں جن کے ہاتھوں میں مشعلِ ہدایت دی گئی تھی وہ آتشیں شعلے لے کر دنیا کو بھونکنے چلے ہیں جو بندگی کا عہد کر کے آئے تھے ان میں نمرودیت اور فرعونیت انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آہ کوئی ان حق کی شہادت دینے والوں کو دیکھے جن کی راہیں کہیں معاشی بد حالی نے مسدود کر رکھی ہیں اور کہیں معاشی خوش حالی نے طائف کی گلیوں میں پھتر کھانے والے رسول کے اسوہ حسنہ پر چلنے کا دعویٰ کرنے والوں کو لوگوں کی کم توہی کا شکوہ ہے۔ کوئی ان نوح - لوط - ابراہیم اور محمد کے پیروؤں کو دیکھے جنہیں لوگوں کی بے حسی اور لاپرواہی فریضہ حق ادا کرنے سے مانع ہے جن کی جیبیں خوفِ اتفاقِ مالی سے بھنچ گئی ہیں جن کی زبانیں خوفِ ملامت سے گنگ ہو گئی ہیں جن کے قدم اس راہ کے کانٹوں کو دیکھ کر اٹھے پھر رہے ہیں جن کی آنکھیں مصائب کی آندھی سے پھرائی جا رہی ہیں۔ بل کی امنڈ امنڈ کر آنے والی لہروں سے جن کے قلوب سینوں میں گھٹ گھٹ گئے ہیں اور جن کی عقلیں راہِ حق کی مشکلات سے حیران و ششدر ہیں۔

آہ کوئی ان راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے جو صدیقی و فاروقی و عثمانی و علوی کے لیل لگائے ہوئے ہیں اور جو یوں سرد ہو گئے ہیں جیسے منہدم قبریں ہوں یا جیسے زمین نے لاشے اگل دیے ہوں۔ جیسے اہرام مصر کی میاں ہوں یا جیسے بت خانوں کے بے جان و بے روح مجسمے ہوں۔

آہ۔ کوئی ان راکھ کے ڈھیروں کو دیکھے جن کے چاروں طرف خود نہیں مناظر ہیں اور دنیا ہلاکت و بربادی اور گمراہی و ذلت میں جکڑ گئی ہے۔ اور ان کی بصارت سلب ہو گئی ہے۔ جن کے ارد گرد کراہوں چنچوں آہوں اور زاریوں کا ایک طوفان ہے اور ان کی سماعتیں اچک لی گئی ہیں، خون اور لاشیں، خدا سے بغاوت اور ظلم و زیادتی ان کے اوپر اور نیچے ہیں۔ اور الٰہی کمر کی ہمت انہیں جواب دے گئی ہے، جو رحمت کی راہیں ٹھونڈے ہیں۔ جن کے استقلال و برداشت کی وسعت خدا کی راہ میں کسی تکلیف کے لئے بے انتہا تنگ ہو گئی ہے جو امنڈتے ہوئے باطل کے سیل کو دیکھ کر حائلقا ہوں کے تنگ گوشوں میں چھپ جانا چاہتے ہیں اور اپنی عاقبت گاہوں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر **لَا يَكْفُفُ اللهُ نَفْسًا اِلاَّ وَسِعَهَا كِتَابًا** کے وپیر پوسے ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ باطل کی قوت و شوکت سے لیل مصالحت جن کی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہی ہے۔ آہ، کوئی انہیں جگائے اور بتائے کہ تم اپنے خدا کو کیسے دھوکا دے سکتے ہو، کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارے یقین آخرت کو دیکھ کیوں کھا گئی ہے، تم اپنے فریضہ حق سے منہ موڑ کر کس درگاہ سے سرخروئی اور نجات کی توقع رکھتے ہو۔

کیا اس عدالت کو بھی دنیا کی کوئی ایسے اور عدالت سمجھ لیا ہے کہ تمہارے ضمیر کی بجائے تمہاری لفظی اور قانونی موٹنگا فیوں پر فیصلوں کا انحصار ہوگا۔ تم اپنی روگردانیوں کا تحفظ حضورِ حق میں کس منہ سے پیش کرو گے، دیکھو کہ وہ راہِ حق پھر تم پر واضح کی جا رہی ہے، سنو کہ وہ بھولا ہوا سبق پھر کسی نے دہرا دیا ہے، اٹھو کہ وہ قافلہ پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑا ہے جس کے تم مسافر کہلاتے ہو۔

آج تم پر حجت تمام ہوئی جاتی ہے اور تمہیں آزمائش کی ترازو میں لا کر ڈال دیا گیا ہے، تم نہ اٹھو گے تو قافلہ چلتا رہے گا، لیکن تم اس منزل سے محروم رہ جاؤ گے جس منزل کے تم مسافر کہلاتے ہو۔



پیکار

ہی نوع انسان کی انسانیت آج اس دردناک دور میں سے گذر رہی ہے جب کہ ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ قدرت کا ہاتھ آگے بڑھ کر ان گروہوں کو آپس میں لڑا دے اور ایک کا ثر دوسرے کی قوت سے رفع کر دے۔

مختلف نسلی اور قومی طبقوں میں بٹنے سے پہلے ہم انسان ہیں۔ قدرت نے ہمیں فطرت اور جنس کے لحاظ سے یکساں پیدا کیا ہے۔ پھر شہر شہر سے اٹھتا ہوا یہ دھواں۔ گلی گلی میں رنگیتی ہوئی یہ تباہی۔ سوڑ موڑ پر لپکتا ہوا یہ انتقام۔ نس نس سے ٹپکتا ہوا یہ خون کیا اس دردناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان اب دردناکی اور حیوانیت کی اس سطح پر آگئے ہیں جہاں جنگل کے خونخوار درندے بھی اس کے سامنے ناوم ہیں۔

آگ۔ تباہی۔ خون اور خنجروں کے یہ زہریلے پھل ان تباہ کن پودوں کی فصل ہیں جو قوم پرستی نے انسانوں کے درمیان بوسیدہ ہیں۔ یہ ان راہنماؤں کی برکات ہیں جن کی راہنمائی کا تخت تفریقِ انسانیت اور زمینی فساد کے نظریے پر ہی جم سکتا ہے۔ اخلاق۔ اعتماد۔ انسانی ہمدردی

اور اصول سے ہٹ کر چلنے والی راہنمائی پوری دنیا کو آگ کے گڑھے پر لے آئی ہے۔ جاہلی تہذیب کی یہ معراج ہے کہ ظلم کے لئے اٹھے ہوئے ایک طاقت کو بھی آج روکنے والا کوئی نہیں رہ گیا ہے۔

اس واحد آسمانی چھت کے نیچے اس ایک ہی دھرتی کے اوپر ہم ایک ہی خدا کے پیدا کردہ انسان ہیں۔ اس خدا کے جس کا سورج بلا تفریق مذہب و ملت و قومیت اور رنگ و نسل ہم سب کو برابر حرارت پہنچاتا ہے۔ جس کا چاند جس کے تارے جس کی ہوائیں جس کا پانی جس کی ساری نعمتیں ہم سب کو برابر فائدہ پہنچاتی ہیں۔ جس کی نگاہِ خلاقیت میں نہ گوراء عزیز ہے اور نہ کالا۔ و مشرقی زیادہ مقرب ہے اور نہ مغربی کو خصوصی نسبت ہے۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس کی نظر میں سب برابر ہیں اور اس کی عنایات سب پر یکساں ہیں۔ اب جب کہ انسانی زندگی کے سارے خود ساختہ نظریات اور اصول وہ تو می جمہوریت ہو یا کمیونزم فاشزم اور یا امپریلیزم ایک ایک کر کے دنیا کے سامنے اپنی ناکامی کا تباہی اور بربادی کی صورت میں ثبوت دے چکے ہیں۔ کیا اب انسان کے لئے یہ موقع نہیں آ گیا ہے کہ وہ خدا کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے کے دوست ہوں دشمن نہیں ہندو ہوں ظالم نہیں ہمسایوں کے محافظ ہوں۔ رہزن نہیں پر محبت ہوں پر عناد نہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ اس بات کا اپنے ضمیر سے پختہ عہد کریں کہ ظلم کو روکیں گے۔ چاہے وہ اپنے ہی گھر سے اٹھے۔

مظلوم کی امداد کریں گے۔ چاہے وہ کسی طبقے سے بھی تعلق رکھتا ہو۔
 حق کا ساتھ دیں گے اور برائی کو اکھاڑ پھینکیں گے اور کوئی نعرہ
 کوئی لٹکار، کوئی لالچ اور کوئی فریب بھی انہیں انسانیت کی اس سطح
 سے گرانے نہ پائے گا جس پر وہ پیدا کئے گئے ہیں۔
 کیا دنیا کی اس وسعت میں ایک بھی انسان ایسا نہیں رہ گیا ہے جو اس
 پکار پر لبیک کہہ کر سلامتی کے راستے کا پہلا سنگ میل ثابت ہو۔



شیر باد

”اے اللہ میں برباد ہو گیا ہوں، تو دیکھ رہا ہے“
زیر لب بڑبڑاتا ہوا وہ ضعیف میکلوڈ روڈ کی سنگین فٹ پاٹھ پر چلا
جا رہا تھا۔ تنہا چلتے چلتے اپنے ناک سے وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا
جس طرح اس کا ننھا پوتا اس سے لڑکھڑا لڑکھڑا کر انتہائی انس و محبت
اور اعتماد سے باتیں کیا کرتا تھا۔ ان الفاظ میں کوئی ایسی شوکت نہ تھی لیکن
قریب سے گذرتے ہوئے جب میں نے وہ الفاظ سنے تو ہمت کے مار
کانپ گیا۔ خوف سے میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ زمین کی طرف
جھٹک کر دیکھا اور گرد و پیش میں ایک عجیب اضطراب سے دیکھا
گویا کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جانے والا تھا۔ کہنے والا بالکل بے خبری
اور محویت میں بڑبڑاتا ہوا گزرا چلا جا رہا تھا۔

ایک کمرہ ور ڈھانچہ۔ گاڑھے کی تمبیس جو دونوں شانوں سے پھٹی
ہوتی تھی۔ ایک ٹلگیا پاجامہ۔ پاؤں میں پٹیا ہوا جوتا جس میں سے اس
کے پاؤں کے پنچے نمایاں تھے۔ گھسٹتی ہوئی ایڑی۔ سر پر ایک بوسیدہ
تولیہ۔ ڈاڑھی سفید اور پریشان۔

اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے قریب سے گزرنے والا شخص اس کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔ اسے اس فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اپنے اللہ سے اتنی حضورِی حاصل تھی جتنی کسی زاہدِ شب زندہ دار کو شب بھر تنہائی اور سکون میں جاگنے کے باوجود بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے الفاظ کہہ رہے تھے کہ وہ کسی بالائے مستی کو دیکھ رہا تھا اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا تھا تو اس بات کا اپنے وجود کی موجودگی سے بھی بڑھ کر یقین رکھتا تھا کہ کوئی اس کی بات کو بہت قریب سے سن رہا تھا۔ اتنا قریب سے جس قدر اس کا اپنا تنفس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ گزر رہا تھا اور زیر لب بڑبڑا رہا تھا تو اس کی آواز یوں تھی جیسے سرگوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے الفاظ خزاں کے جھونکے کی طرح تھے۔ اس کے الفاظ میں وہ گہرا جذبہ تھا جو کسی قریب ترین جانی بوجھی ہستی کے لئے پیدا ہو سکتا ہے۔ کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کوئی تکلف نہ تھا۔ کسی دور کی ہستی سے وہ مخاطب نہ تھا۔ کسی بے جانی بوجھی ہستی کا غائبانہ ذکر نہ تھا۔

اتنا قریب، اتنی حضورِی، اتنی بے تکلفی، اتنا خلوص، اتنا اعتماد اور اتنا یقین، کہنے والے کو سننے والے سے کبھی ایک دوست کو دوسرے دوست سے نہ ہوا تھا۔ جتنا فٹ پاتھ پر چلنے والے اس ضعیف آدمی کو حاصل تھا۔

”اے اللہ! میں برباد ہو گیا ہوں تو دیکھ رہا ہے۔“

اور ان الفاظ میں کہنے والے کی ساری داستان پر شیدہ تھی۔ اسے داستان سنانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جس سے وہ بات کر رہا تھا وہ داستان کی تفصیلات سے بے نیاز تھا۔ وہ سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی اتنی ہی قربت سے جانتا تھا جس قدر لاوڈ سپیکر پر کہی ہوئی بات کو۔ وہ ان خیالات سے بھی آگاہ تھا جو ایک تئلے ہوئے معصوم بچے کے ذہن میں پرورش پاتے تھے اور ان سے بھی آگاہ تھا جو مرنے والے کی گنگ زبان سے ادا نہ ہو سکتے تھے۔ وہ اس قادرِ مطلق سے اپنی دوجنی داستان کہہ رہا تھا۔

”اے اللہ میں برباد ہو گیا ہوں اور تو دیکھ رہا ہے۔“

مجھے ڈر معلوم ہو رہا تھا کہ جس سے وہ بات کہہ رہا تھا اس کی مٹھی میں تو یہ ساری کائنات تھی۔ اس کی مٹھی میں تو ان برباد کرنے والوں کی پیشانی کے بال تھے جنہوں نے اسے درد مند کیا تھا۔ اس فریاد کرنے والے کی آواز میں۔ میں نے انتقام کو بھڑکا دینے والا وہ عجز محسوس کیا جو اللہ کی مدد کب آئے گی بے کے جملے پر اعدا کے جھٹے میں آیا کرتا ہے۔ اس کے اس قوی ترین عجز نے۔ اس کی اس انتقام انگیز فریاد نے اس کی اس بے لفظ داستان درد نے میرے اندر ایک گہرا گھاؤ لگایا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلب پر ایک برف کی سل تھی جو اس کی گرمی فریاد سے پانی پانی ہو کر بہ گئی۔ پاش پاش ہو گئی تھی بے حس کی ایک چٹان تھی جو ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور اس چٹان کے نیچے میں نے اپنے عجز

اور بندگی کو تازہ دم پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو بندگی میری توت تھی اسے
میں نے ایک عرصے سے جمود بے حسی بلکہ سنگدلی کے نیچے دفن کر رکھا تھا
اور اس کی توت سے بے خبر تھا۔

اس کا اپنے اللہ سے اتنا قرب اور اعتماد انگیز طرز عمل دیکھ کر
میرے اندر بھی ایک خروش بیدار ہو گیا۔ وہ شخص کتنی بڑی طاقت
کو متحرک کر رہا تھا۔ کتنی بڑی پناہ کو آواز دے رہا تھا۔ کتنے بڑے
ذریعے کو بلا رہا تھا۔ کتنے بڑے وسیعے کو پکار رہا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں
کے مقابلے میں اسے لارہا تھا جس کی مسطحی میں پہاڑوں کے سلسلے اور
جس کے اشارے پر اجرام فلکی کے گولے حرکت کرتے تھے۔ اس کے
لئے قلب میں اس گداز کی اعتماد میں اس توکل کی اور سعی میں اس بھروسے
کی ضرورت تھی جو فریاد رس کو اگر دیکھ نہ سکے تو کم از کم اس کے وجود
کو اپنے قلب سے بھی زیادہ قریب محسوس کر سکے۔

ایک خروش میرے سینے میں ابلنے لگا۔ ایک فریاد جو بے لفظ تھی
لیکن داستاں در داستاں تھی جو کربلا سے شروع ہوتی تھی اور بالا کوٹ
تک پھیلتی چلی جاتی تھی جس میں امام حسین سے لے کر حسن البنا شہید تک بہتر
نظر آتے تھے۔ وہ فریاد بے لفظ اور بے آواز میرے سینے میں ابلنے لگی۔ مجھے
بھی اپنے رب سے فریاد کرنی تھی۔ مجھے بھی اپنے رب سے کچھ کہنا
تھا۔ بہت کچھ کہنا تھا۔ اتنا کچھ جس کے لئے الفاظ کے اشارے بھی کافی نہ
تھے۔ اتنا کہنا تھا جتنے میرے جسم پر بال تھے۔ جتنے آسمان پر تارے

تھے۔ جتنے سمندر میں قطرے تھے۔ جتنے صحرا میں ذرے تھے۔ لیکن میرے پاس الفاظ نہ تھے۔ صرف ایک غبار تھا جو قلب سے آسمان تک پھیل گیا تھا۔ اور میں اس غبار میں خزاں دیدہ پتے کی طرح اڑ رہا تھا۔
 ”میرے اللہ تیرا دین مغلوب ہے اور تو دیکھ رہا ہے۔“

یہ الفاظ میرے ہونٹوں سے پھیل کر نکل گئے تھے۔ جیسے چڑھی ہوئی کمان سے تیر نکل جاتے۔ لیکن وہ غبار تھا جو قلب تک چھایا جا رہا تھا۔ اس جگہ سے اس میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ آندھی چڑھتی رہی۔ بے لفظ داستان سینے میں ابلتی رہی۔ بے آواز فریاد سینے میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرا قلب قبلہ رخ ہو کر میرے سینے میں سجدہ ریز تھا۔ عجز اور بندگی کو دعوت دے رہا تھا کہ آئے اور اس کے وجود کو مالک حقیقی کے سامنے پوری عاجزی سے پیش کرے غبار پھر الفاظ میں ڈھل رہا تھا۔

”کیا یہ وہی وقت ہے جب تیرا نام لینا مسمیٰ میں انگارہ پکڑنے کے مانند ہو جانے والا تھا۔ اگر یہ وہی وقت ہے تو مجھے ان انگاروں میں دن کو دے۔ اس لئے کہ یہ وہی آگ ہے جو ابراہیمؑ کے لئے بھڑکاٹی گئی تھی۔“
 ”میرے اللہ تاریخ پھر ایک زمانے کے بعد معرکہ بدر کو دہرانے کے لئے آئی ہے۔ ایک مسمیٰ بھر جانتا جو صرف تیرے لئے جنیا اور مرنا جانتے ہیں۔ اور جن کو اس بانجھ معاشرہ انسانی نے صدیوں کے بعد جنیا ہے۔ جن کے لئے صدیوں بعد تاریخ اپنا سینہ کھول کر آئی ہے کہ اس پر بڑھ کر تیرا

نام لکھ دیا جائے۔ اس وقت جب کہ برسوں خون کو سپینہ بنا کر بہانے کے
 بعد تیرے بلند نام کو چار دانگ عالم میں پکارنے کے لئے ایک مینار
 کی ابتدا سے تعمیر ہوتی ہے اور طاقت کے ساتھی بڑھ چڑھ کر اس
 تعمیر کو گرا دینے کے لئے حملے اور سازشیں کر رہے ہیں۔ تو دیکھ رہا
 ہے کہ ایک طرف ساز و سامان ہے اور دوسری طرف تیرے نام کی
 ٹوٹ اور تیرے برسوں کی غیرت کا بہارا ہے اور تو دیکھ رہا ہے کہ
 تاریخ کے اس دور نے سیکڑوں ابھیل اور ابولہب جنم دے دیئے
 ہیں۔ بستیوں کے سر پر منافقت کا تاج رکھ دیا ہے اور ایک بڑے زور
 کی کشمکش سر پر کھڑی ہے۔ ماموں اور بھانجا۔ بھائی اور بھائی۔ چچا اور بیٹھا
 باپ اور بیٹیوں آمنے سامنے آئے ہیں جیسے تباہی آئے تھے۔ جب
 تیرا نام پکارنے کے لئے صدیوں پہلے ایسا ہی ایک معرکہ برپا ہوا تھا۔ اگر
 اس دور میں تیری مشیت کی سنت یہ ہے کہ آریسوں کو چہرے تو یہ
 جسم تیری راہ میں بکے ہوئے ہیں۔ اگر یہ اشارہ ہے کہ لوہے کی گنگھیاں
 اپنا فرض ادا کریں تو یہ تیرا ہی مال ہے تو اسے جس تھاب کے حوالے
 کرنا چاہیے کر دے۔ لیکن تو بہتر جانتا ہے اور تجھ سے بڑھ کر کس میں
 جاننے کی بہت ہے کہ یہ مسمیٰ بھرا انسان صرف تیرے ہی نام کا مینار
 تعمیر کر رہے ہیں اور تیری ہی اذان حق بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اور تجھے
 ہی منانے کے لئے سارے جہان سے روکھے ہوئے ہیں اور تیری
 ہی چشم القفات کا ایک گوشہ ان کے لئے بہارِ زندگی ہے۔ تو انہیں

برباد نہ ہونے ویسے۔ ان کی دستگیری فرما۔ تو دیکھ رہا ہے کہ وہ اس لئے طوفان میں کودے ہیں کہ تو ڈوبتے سفینوں کو تیرانے والا ہے ان کے پاس تجھے راضی کرنے کے لئے اپنی متاعِ زندگی اور عجز کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ تیرے حنور میں پیش کرتے ہیں۔

یہ بے صوت داستان میرے سینے اور ہونٹوں کے درمیان کانپتی رہی اور میں گرد و پیش سے بے خبر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ گرم گرم آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اپنی بندگی اور عجز کا اظہار کرتے ہوئے سنگین فٹ پاتھ پر جا پڑے۔ غبار چھٹ گیا۔ طوفان گزر گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ کہنے والے کو جو کچھ کہنا تھا وہ بے کہنے سننے والے نے سن لیا تھا اور اتنا قریب سے سنا تھا کہ شاید اتنا قریب خود کہنے والے کو اپنا بھی وصل نہ تھا۔

○

سید علی حسینی

ایک بزرگ فرماتے ہیں

یہ مضمون نامکمل ہے اور جب تک ہمارے معاشرے پر تضاد و ٹکر و عمل حکمران بن کر مسلط ہے اس کی تکمیل بھی ناممکن ہے۔ اس لئے اسے نامکمل ہی مکمل سمجھ لیا جائے۔ (اگ)

”چاہیے“ کا لفظ کسی شخص کی دلی تمنا کا اظہار کرتا ہے اور محض ”تمنا آدمی“ بالعموم ان چیزوں کی کرتا ہے جو اس کے بس میں نہ ہوں جن کی ضرورت کا شدید احساس اور جن کے وجود کی اہمیت اس کے نزدیک بہت زیادہ ہو۔ لیکن ان کا حصول بڑی حد تک اس کے بس سے باہر ہو جس کے بس میں ذرا بھی کچھ اختیار ہو وہ اس چیز کو سب سے پہلے عمل میں لانا ہے۔ جس کے لئے ”چاہیے“ کا لفظ اس نے اپنے درجے اختیار کیا ہے۔

لیکن جہاں قلب کی بیماری اور اخلاص کا فقدان موجود ہوں اور ان دونوں نے منافقت کی کھیتی تیار کر رکھی ہو وہاں ”چاہیے“ کا لفظ عجیب و غریب معنی پیدا کر دیتا ہے۔ وہاں جو زبان سے ”چاہیے“ ہو وہ دراصل ہاتھ اور پاؤں سے نہیں چاہیے ہوتا ہے اور جو ہاتھ اور پاؤں سے ”چاہیے“

ہوتا ہے وہ زبان سے "نہیں چاہیے" ہوتا ہے۔ اختیارات کی موجودگی میں ایک شخص کا بے بسوں کی طرح محض "چاہیے" کہنا اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر اس "چاہیے" کو "نہیں چاہیے" کے خانے میں درج کر دینا یا تو بھاری مکارانہ منافقت ہے یا بڑی شدید جہالت کم علمی اور تدبیر کار سے بے خبری ہے یا تو وہ اپنے "چاہیے" کو پہچانتا نہیں ہے اور محض اس کی تمنا کرتا ہے اس صورت میں وہ احمق اور بلیڈ الذہن ہے اس لئے کہ اگر وہ پہچانتا نہیں ہے تو ان لوگوں سے مدد لے جو اسے پہچانتے ہیں اور اپنی غلط شناخت کی بجائے اصل شناخت کر نیوالوں پر بھروسہ کرے اور یا پھر دراصل اس کا "چاہیے" اور ہے لیکن لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے اس نے لوگوں کے "چاہیے" پر خود بھی "چاہیے" کا ٹیبل لگا رکھا ہے۔ اس صورت میں اس کی منافقت بلاشبہ بڑی گھناؤنی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے نفاق کا علاج کرنا اس کی قوم کا فرض ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں "اسلامی علوم کو رواج دینا اور انہیں پھیلانا چاہیے" اور یہ کہہ کر وہ ان کالجوں اور یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں خالص غیر اسلامی طرزِ تعلیم اور خالص لحدانہ نصابِ تعلیم جاری رکھتے ہیں جو قوم نے ان کے اکتھوں میں اس لئے دیکھے ہیں کہ وہ ان میں اسلامی علوم کو رواج دیں۔ انہیں "چاہیے" کہنے کے بعد اپنے قول و فعل کے اس تضاد میں نہ ذرا اخلاقی گراؤٹ محسوس ہوتی ہے اور نہ کسی معذرت کی ضرورت

ایک بزرگ فرماتے ہیں: "مہاجرین کی آباد کاری جلد از جلد عمل میں آجانی چاہیے۔" اور یہ کہہ کر گویا وہ ان کی آباد کاری سے بھی پوری طرح غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان لاکھوں خانہوں پر باد پاکستان کے محاروں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے ان "چاہیے" کے دعویدار صاحب کے عملے میں سے کسی نے آباد کیا ہو ورنہ بیشتر ان میں سے خود ہی آکر جدھر کسی کے سنگ سہاٹے ادھر گھسی گیا۔ کوئی کسی دوست پر نہ گیا کوئی کسی عزیز کے ہاں پناہ گزیں ہو گیا۔ کسی نے اپنی قوت بازو سے اپنے لئے بیٹھنے کا ٹھکانہ بنا لیا۔ کسی نے جرائم پیشگی اختیار کر لی اور جو بالکل ہی کمزور اور بے سہارا تھے اور جن کی آباد کاری ہی اصل کام تھا وہ آج بھی شہروں کے فٹ پاتھوں پر جا بجا مل جاتے ہیں جو بھیک مانگ مانگ کر جی رہے ہیں یا موت و زلیست کے درمیان معلق ہیں۔ بڑی کثرت سے بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھار گدا گروں کی طرح ان پر جو عنایات کی جاتی ہیں۔ یہ ان کی انسانیت کو مزید قتل کرنے کے مترادف ہے تاکہ ان کا مزاج گداگری پوری طرح پختہ ہو جائے اور ان کی شرم و حیا کا روناہا نوخیزہ بھی ختم ہو جائے۔ یہ ندامت آباد کرنے کی نہیں بلکہ مستقل برباد رکھنے کی ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں: "قوم میں اسلامی اخلاق ابھارنا چاہیے اور یہ کہہ کر اپنے تمام ذرائع نشر و اشاعت سے کہہ کر جو قوم ہے ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قوم میں اسلامی اخلاق ابھاریں۔ قوم پر غمناکی اور

بے حیائی کی مہم لے کر ہل پڑتے ہیں۔ گھر گھر میں عشقیہ گانے سنواتے ہیں۔ گندے رسائل بکواتے ہیں۔ معیاری، اخلاقی اور احتسابی پالیسی رکھنے والے جرائد کا گلا گھونٹتے ہیں۔ اور ان کی معاشی کمزوری ہے۔ اور فحش جرائد کو اخلاقی تعلیم کا نصاب سمجھ کر گھر گھر پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں "کشمیر جلد از جلد حاصل کر لینا چاہیے۔" اور پھر

یونہی ہیں۔ او میں جا کر ایک جاہل دیہاتی مقدمہ باز کی طرح اپنا مقدمہ دائر

کرتے ہیں۔ اور واپس آ کر اپنے گھر میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سو رہتے

ہیں اور کبھی کبھی اچانک اٹھ کر دنیا کے ناکام ہتھکنڈوں کے مطابق کبھی

کشمیر ڈسے مناسبتے ہیں۔ کبھی اپنے جلسوں میں اور ٹیڈیو پر مخالفین کو

کو سس لیتے ہیں۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ خدا لگتی بات کہتا ہے اور مردانہ وار

معاہلات کو سمجھنے اور ان سے بچنے کا مشورہ دیتا ہے تو غدار اور انتشار

پسند کا ایک نعرہ لگا کر جو جہاد انہیں محاذ کشمیر پر جا کر لڑنا چاہیے وہ

اس نیک مشورہ دینے والے کے خلاف گھر میں ہی لڑا ڈالتے ہیں۔ اور

اس پر سمجھ لیتے ہیں کہ میدان جیت لیا۔ حالانکہ میدان توپ و تفنگ سے

جیتے جاتے ہیں۔ بہتان تراشی اور الزام تراشی سے نہیں جیتے جاسکتے۔

اس طرح "چاہیے" کا ورد کر کے سال پر سال گزار دئے جاتے ہیں۔

لیکن محض ورد کرنے سے تو ایک "کیک" بھی منہ تک نہیں پہنچتا، محاذ

کیسے فتح ہو سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں "ہمارا آئین اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا

چاہیے" اور یہ کہہ کر وہ کبھی بھارت کا دستور لے آئے ہیں کبھی امریکہ کے دستور کو لالچ بھری نظر سے دیکھتے اور اس کی نقل آتے ہیں کبھی برطانیہ پر حسرت آمیز نظر ڈالتے ہیں کبھی اپنے ناک کے کس بد بخت خاں سے بردار سے کہلاتے ہیں کہ "ایک شخص کی زندگی ہمیشہ کے لئے کیسے نمونہ بن سکتی ہے" کبھی قرآن سے دستور کی نفی کرنے والے کو امید بھری نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے فوراً معاوضہ پیش کرتے ہیں کبھی بھانت بھانت کے پرندوں کو منافقانہ بولیاں بولنے کے لئے جمع کرتے ہیں لیکن "چاہیے" کی حد تک وہ ضرور اس بات کا بار بار اعادہ کرتے رہتے ہیں کہ "اسلامی دستور ہونا چاہیے" حالانکہ ان کا قول اور فعل ان کے بارے میں بہت غلط انداز سے پیش کرتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں "ہمیں نبی کریم کی پوری پوری پیروی کرنی چاہیے اور یہ کہہ کر وہ چچا سام اور جان بل کی پیروی کے لئے چلے کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اپنے اس قول کی ترویج کرتے چلے جاتے ہیں۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "ہماری خواتین کو حضرت عائشہؓ کا اسوہ سامنے رکھنا چاہیے" اور پھر وہ اپنی ایک بلڈن کو سڑک پر سے پریدہ کراتے ہوئے کسی اجنبی غیر ملکی مہمان کے استقبال کے لئے ایئر پورٹ کی طرف لے جاتے ہیں تاکہ اپنی قومی غیرت و حمیت کا ہدیہ اس کے سامنے پیش کر سکیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں " ہمیں خالد اور طارق کی روایات کو زندہ کر دینا چاہیے اور پھر اپنی خارجی پالیسی اور بیرونی تعلقات میں وہ بزدلانہ طریقہ عمل اختیار کرتے ہیں کہ اس پر دشمن بھی ہنستے ہیں اور دوست بھی کف افسوس ملتے ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں " رشوت اور سمگلنگ ختم ہونا چاہیے۔" اور پھر ان اختیارات کو جو ان کا قلع قمع کرنے کے لئے ان کے ہاتھ میں دیئے گئے ہیں انہیں کے بل بوتے پر وہ ان دونوں ذرائع آمدنی سے اپنا بینک بلینس برابر بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں " ووٹ عوام کا حق ہے اور انتخابات حاصل جمہوری اصولوں کے مطابق ہونے چاہیے۔" لیکن اس چاہیے کا اظہار و صوتس دھاندلی، دھوکا و شام، دھمکی اور واروگیر کے ذریعہ ہوتا ہے اور جو حساب چھپی پٹہ ٹوڑ آواز سے اس چاہیے کا اعلان کرتے ہیں وہی اپنے جمہوری اوزار سے کرا انتخابات لڑنے کے لئے چل کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں " ہمارے تاجروں کو اپنے معاملات درست اور اسلام کے اصولوں کے مطابق رکھنے چاہیے۔" ادد یہ کہہ کر وہ ایسے حقائق صواب و معصوم مرتب کرتے ہیں جو تاجروں کو مجبور کریں کہ وہ اسلامی اصولوں کو تو کسی قیمت پر ملحوظ نہ رکھ سکیں۔ ان کو دہرے حسابات رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ رشوتوں کے دروازے کھولتے ہیں۔ مارکیٹ کے بھاؤ اپنے مفاد کے پیش نظر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ اپنے پالیسی کے

راز ملک خود افشا کر دیتے ہیں، بڑے بڑے کارخانوں میں اپنا حصہ لگاتے ہیں
مال روک کر بھاؤ بڑھاتے ہیں اور ساری معیشت کی گاڑی کو سود، رشوت
بلیک مارکیٹ اور سنگنگ کی غلامیوں سے بھر دیتے ہیں۔ بچوں، نوجوانوں
اور رقصوں کی بھرا میں اپنے اس قول اور اس فعل کے فرق پر غور کرنے
کے لئے کبھی وقت نہیں نکال سکتے۔

اس طرح چاہیے، کالیبل لگا کر نہیں چاہیے، کو عمل میں لایا جاتا رہتا ہے
اور قوم کو بوقت بنانے کے لئے چاہیے، کو اپنی گہری تمنا کا اظہار
بنا کر پیش کیا جاتا رہتا ہے، زبان کچھ کہتی رہتی ہے، ہاتھ اور پاؤں کچھ
اور کرتے رہتے ہیں، لیکن یہاں آنکھوں والے بھی موجود ہیں جو ان کہنے
اور کرنے میں ہمالیہ برابر تھا درکھنے والوں کے اس تضاد کو دیکھ کر غوام
کو آگاہ کر سکیں، سونے والے اب جاگ رہے ہیں، یہ چوری ہمدردی
کے روپ میں اور یہ منافقت ایمان کے رنگ میں زیادہ دن نہ چل سکے
گی۔ ایک عام آدمی کا یہی خیال ہے۔



مولوی اور مسلمان

ہر وہ نشان جو ایک عام مسلمان کے لئے اس کے مسلمان ہونے کی علامت تھا اب سوسائٹی نے وہ مولوی کے لئے خاص کر دیا ہے تاکہ عام مسلمان کو ہر طرح کھلی چھٹی مل جائے۔

اس کا مظاہرہ شب و روز ہوتا رہتا ہے۔

ایک عام مسلمان ہونے کے لئے بنیادی شرائطیں یہ بھی ہے کہ وہ نماز پڑھے لیکن آج جو شخص نماز پڑھے اسے ہماری سوسائٹی مولوی صاحب کہتی ہے۔ گویا نماز پڑھنا تو مولوی کا کام ہے اور ایک سیدھا سادھا مسلمان جو بہر حال مولوی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ نماز سے آزاد ہوگا اس لئے کہ آخر ہر شخص کیسے مولوی ہو سکتا ہے۔

ڈاڑھی رکھنا سنتِ رسول ہے اور ظاہر ہے کہ رسول کی سنت ہر مسلمان کے لئے ہی ہے۔ لیکن آج جو شخص ڈاڑھی رکھتا ہے اسے ہماری سوسائٹی مولوی صاحب کہتی ہے۔ گویا ڈاڑھی رکھنا مولوی کا کام ہے اور ایک سیدھا سادھا مسلمان جو بہر حال مولوی نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ وہ ڈاڑھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے کہ ہر مسلمان مولوی تو نہیں ہو سکتا۔

نیکی کا مشورہ اور بھلائی کی نصیحت کرنا مسلمان کے فرائض میں سے ہے۔
لیکن آج جو شخص یہ کام کرے اسے ہماری سوسائٹی مولوی صاحب کہتی
ہے گو یا نیکی کی تلقین کرنا تو مولوی کا کام ہے۔ ایک عام مسلمان تو ظاہر ہے
کہ برائی ہی کر سکتا ہے اس لئے کہ ہر مسلمان تو مولوی نہیں ہو سکتا۔

عرض ہر وہ کام جو مسلمان کے مسلمان ہونے کے لئے لازمی علامت
تھا اب اسے مولوی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور ایک عام مسلمان
ان پابندیوں سے آزاد ہو کر محض "ایک آدمی" ہو کر رہ گیا ہے اور وہ
ایسی پابندیوں کو مولوی ہونے کی علامت سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر
مسلمان مولوی تو نہیں ہو سکتا کہ وہ ان پابندیوں کا پابند ہو کر مولویانہ
زندگی گزارے۔

اس طرح ایک عام مسلمان کا معیار مولوی کے حوالے کر کے عام مسلمان
سوسائٹی نے اپنا مقام اس جگہ بنا یا ہے جہاں مسلمان ہونے کی کوئی
پابندی بھی اس پر لاگو نہ ہو سکے۔

مگر مومنوں پر کشاوہ ہیں را ہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں



حیل کے نام

مٹی اور پتھر کی اونچی دیواروں تمہیں میرا سلام پہنچے اور
تمہاری آغوش میں ایسی محبوب ہستی ہے جس نے تمہیں بھی میری
نظر میں محبوب بنا دیا ہے۔ کاش تم میری باتوں کا جواب دے سکتیں تو
میں تمہارے ساتھ دوستی پیدا کر لیتا۔ تمہارے حالات زندگی تفصیل سے
پوچھتا۔ تمہاری آغوش میں کیسے کیسے لوگ آئے اور ان سے تم نے کیا
کیا تاثر قبول کیا۔ کیا تم نے امام ابن تیمیہ کا نام سنا ہے۔ کیا تم ابو حنیفہ
سے آگاہ ہو۔ تم نے ابن حنیبل کی تو ایک مدت تک رفاقت کی ہے شیخ
سرخندی کو بھی تم نے اپنی آغوش میں ایک مدت تک رکھا ہے۔ آج بھی
تمہارے پاس اسلام کی ایک تلوار محفوظ ہے۔ بتاؤ تمہاری ان لوگوں کے
بارے میں کیا رائے ہے۔ لیکن تم تو گونگی ہو۔ نہ بولتی ہو نہ جواب دیتی
ہو۔ سنگین خاموشی سے ٹک ٹک دیکھتی ہو۔

آج جو ایک گویا ہر بے بہا تمہارے پاس ہے اس کی کوئی بات بتاؤ
تم تو اس کے قریب ہی رہتی ہو۔ تمہارا ایک حصہ تو اسے شب و روز
دیکھتا ہے۔ تم نے ایک بات سنی تھی۔ اوہ بات یہ تھی کہ کچھ لوگ اسے

پھانسی کی طرف گھسیٹے لئے جا رہے تھے وہ تو پوری ملت نے اپنی انت
کو بکڑ کر ٹھام لیا اور اوپر سے قاورِ مطلق کی تقدیر نے اس کی اجازت نہ
دی۔ ہاں تو وہ اسے سنگینوں، بندو تلوں اور اپنے خرفناک ہتھیاروں
کی چھاؤں میں دار کی طرف لئے جا رہے تھے۔ یہ خیال کر کے کہ ہم تو
اسی ملک میں سب سے قوی ہیں، ہم ہی رب ہیں، ہم ہی مالک ہیں
جس کو چاہیں زندہ رکھیں، جس کو چاہیں مار دیں، چنانچہ انہوں نے خبروں
کو چھوڑ کر اپنی حیات بخشی کی یودی دلیل ڈاکر پیش کر دی اور معصوموں کو بکڑ کر
دار کی طرف لئے چلے۔ یہ بتانے کے لئے کہ وہی رب تھے، مالک
تھے اور اس زمین میں انہیں کا حکم آخری تھا اور وہ بے نیاز اور مہتمم
انداز میں دار کی طرف چلا جا رہا تھا۔

کسی نے پوچھا: "اے شخص اس حالت کے بارے میں تمہاری
کیا رائے ہے؟" اس نے کہا: "قاورِ مطلق کو اگر یہ منظور ہے تو بندہ
راضی برضا ہے اگر منظور نہیں ہے تو یہ لوگ اس سے عاجز ہیں جو کرنا
چاہتے ہیں۔"

تم یہ بتاؤ جب اس نے یہ بات کہی تھی تو اس کے وقار کی اشد
سے تمہارا سینہ شق نہیں ہو گیا تھا اور کیا وہ جو اسے یوں گھسیٹ کر
وہاں پہنچانا چاہتے تھے، اس کی عظیم شخصیت کے سامنے مکھیوں کی مانند
حقیر نہیں ہو گئے تھے۔ میں اس بارے میں تمہارا تاثر خصوصی طور پر جاننا
چاہتا ہوں۔ کیوں کہ تم اس ساری دار و گیر کی عینی شاہد ہو۔

اور یہ جو تمہارا آپنی پھاٹک ہے، سنا ہے اس تک وہ کئی بار اپنے
 ملنے والوں سے ملنے آتا ہے، اسے چھوٹا ہے اور اپنے ساتھ
 سے بانیں کرتا ہے۔ بخدا ایسا خوش بخت تمہارا پھاٹک ہے اور کسی
 خوش بخت تم ہو جس کا ایسا پھاٹک ہے، تمہاری کیسی فضا ہے جس
 میں وہ سانس لیتا ہے، کیسی زمین ہے جس پر وہ رہتا ہے اس
 کے کیسے مکین ہیں جن کو اس کی صحبت مستعد ہے، کبھی موقع ملے
 تو میرا سلام اس تک ضرور پہنچا دینا اس لئے کہ میرا خط اس تک پہنچنے
 نہیں دیا جاتا، کچھ لوگ درمیان میں احتیاط کی چھلنی لگاٹے بیٹھے ہیں۔
 تمہیں عفت یوسف کی قسم، میرا ایک پیغام اس تک پہنچا دینا، بالکل
 خاموشی کے ساتھ اس کے کان میں چھوٹک دینا، کہنا ایک دور افتادہ
 کہتا ہے کہ "آپ ہمیں اتنے بڑے پتھر سے پتھر سے میں مقید چھوڑ کر خود ایک
 کونے میں آزادی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ بس یہ کہنا اور باادب
 پلٹ آتا اور ہاں یہ بھی کہنا، ان سے نہیں اپنے بنانے والوں سے۔
 خاموشی سے نہیں بلکہ اپنی پوری قوت سے چیخ کر ایسی آواز سے کہ
 تمہاری آواز کراچی سے قاہرہ تک سنائی دے کہ ایک دار سے کام نہ
 چلے گا۔ نہ ایک جیل سے، نہ ایک فوج سے، نہ ایک زندگی سے تم نے
 باطل کے محافظوں، تاریخ کے سینے پر کتنی بار دار و درمن لے لے کر ابھرو گے،
 کتنی جلیں تعمیر کرو گے، کتنی فوجیں لے لے کر آؤ گے، کتنی بار پیدا ہو ہو کر
 مرو گے، حق کا سپاہی بار بار ہر دور میں آئے گا اور تمہاری کمر پر شدید

ضربیں لگائے گا۔ حق تو زندہ جاوید قوت کا نام ہے۔ جذبے اور عقیدے کا نام ہے اسے اگر دار پر لٹکا دینے کی ہمت ہو تو ضرور اپنی سی کر گزرو اور کوئی کسر نہ چھوڑو۔

اور پھر جب تمہیں موقع ملے تو ان کی خدمت میں ایک پیغام اور پہنچا دینا۔ کہنا جو قافلہ آپ نے مرتب کیا ہے اور اس کے سامنے جو منزل نمایاں کی ہے وہ اپنی منزل تک پہنچ کر دم لے گا۔ قافلہ حق جیب رواں ہو جائے تو پھر نہ فرعونوں کے قوت و شوکت کے منظر ہر اس کی رفتار کم کیا کرتے ہیں اور نہ وسیع و عریض طوفانی لہروں والے نیل اس کی راہ روک سکتے ہیں۔

مٹی اور پتھر کی اونچی دیواروں! ان تک میرا سلام ضرور پہنچا دینا! اور کہنا کہ آپ کی یاد میں قافلے کے قدم تیز تر ہو گئے ہیں! بس صرف یہ کہ آپ بہت یاد آتے ہیں۔

(۱۳۵۳ھ)



یومِ عالمِ اسلام

آج یہاں یومِ عالمِ اسلام منایا جا رہا ہے۔ ہال میں رنگ برنگ لباس جمع ہو رہے ہیں۔ کوٹ تیلو نہیں اور ٹائیاں، ترچھی ہانگلیں اور بوالہوس لگا ہیں۔ مسرخی پاؤڈر اور خوشبوئیں اڑتے ہوئے دامن اور لہراتے ہوئے بال۔ مسلمان سامعین جمع ہو رہے ہیں۔ مسلمان منقرہ تشریف لارہے ہیں

آج یہاں یومِ عالمِ اسلام منایا جا رہا ہے۔
 اونچی ایچ پر کرسیاں لکھی ہیں۔ یہ اونچی جگہ۔ مسلمان برہمنوں کے
 نئے سہے۔ فرش اپنی ساری نستی کے ساتھ ہال میں بچھا ہوا ہے۔ یہ
 مسلمان شوروروں کے لئے ہے۔ برہمن اکڑا کرہ کرہ کیوں پر اپنی عظمت
 اور شوکت، شان اور برتری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ سب تاشدین
 اور معززین ہیں اور شورور سمٹ سمٹ کر فرش پر اپنی بے وقعتی،
 گھٹیا پن اور بے زبانی کا اعلان کر رہے ہیں
 یہ سب مسلمان عوام ہیں۔ یہ اسلامی برادری کا اجتماع ہے۔ یہ
 اسلامی سوسائٹی کے نعرہ ہائے مساوات کا جوابی عمل ہے۔

آج یہاں یومِ عالمِ اسلام منایا جا رہا ہے۔

اسٹیج کی نشیت پر ایک بہت بڑا نقشہ لٹک رہا ہے۔ یہ ایک صوبے کا نقشہ ہے۔ "عالمِ اسلام" کا یوم منانے والوں نے یہ نقشہ لٹکایا ہے۔ غالباً یہ نقشہ اس لئے لٹکایا گیا ہے کہ اہل کی تزیین میں اصنافِ ہندو ورنہ ظاہر ہے کہ کھوڑ پڑی میں بھیجا رکھنے والا کوئی شخص بھی کسی صوبائی نقشے میں عالمِ اسلام کی وسعت کی طرف کوئی اشارہ نہیں پاتا۔ لیکن پھر بھی یہ نقشہ اس لئے لٹکایا گیا ہے کہ آج یہاں یومِ عالمِ اسلام منایا جا رہا ہے۔

اسٹیج کی دائیں طرف کچھ کرسیاں ہیں اور بائیں طرف بھی کچھ کرسیاں ہیں۔ بچوں کے پنکھوں کے نیچے ایسے نیچے چہروں والی کچھ نسوانی صورتیں ہیں۔ اس اہمیت کی باتیں بہنیں اور بیٹیاں پورے تہرج جاہلیت کے ساتھ "اسلامی حیا اور ترقی" کا نمونہ بنی بیٹھی ہیں۔ اس لئے کہ۔

"آج یہاں یومِ عالمِ اسلام منایا جا رہا ہے۔"

ویسی صاحبوں کے جھرمٹ میں مسز سفر اے بھی موجود ہیں۔ یہ اجتماع عالمِ اسلام کی ترقی بہبودی اور اتحاد کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا ہے۔ آج اس کے صدر سردار فرنگ نواز خان ہیں۔ یہ قوم کے بھی اتنے ہی وقار دار ہیں جتنے کسی فرنگیوں کے ہوتے۔ ان کی رگِ اسلامیّت بہت سست ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہیں اسلامی معاشرت سے دلچسپی نہیں ہے۔ ان کے طور و اطوار میں کہیں بھی اسلام کی

وفاداری کا کوئی دھبہ نظر نہیں آتا۔ وہ پردے کے سخت مخالف ہیں۔ وہ نماز کا مضحکہ اڑانے کو فیشن سمجھتے ہیں۔ انہیں اسلام سے وفاداری کا دم بھرنے والا ہر شخص ملا نظر آتا ہے۔ انہیں ملاؤں سے نفرت ہے۔ اس لئے کہ ملا بڑا کٹ جھٹی ہوتا ہے۔ کہتا ہے نماز پڑھو۔ کتنا جاہل ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ سردار صاحب کا اسلام پر کیا کم احسان ہے کہ وہ مسلمان کہلائے جانے پر راضی ہیں۔ کہتا ہے عورتوں کو پردہ کراؤ۔ یہ حسین حسین چہرے جو مجلسوں کی رونق محفلوں کی جان اور مجلسوں کا نور ہیں۔ انہیں شرم و حیا کے دبیز پردوں میں مھلا کیوں چھپا یا جائے۔ اور پھر پردے کے جواز میں قرآن میں سے آیات پیش کرتا ہے۔ حالانکہ نہیں جانتا کہ سردار صاحب کے پاس بھی ایک قرآن ہے اس میں پردے کا کہیں حکم نہیں ہے بلکہ پردہ اٹھا دینے کا حکم ہے۔ ملا کی اسلام سے یہ کیسی ناواقفیت ہے یہ تو صریحاً اجارہ داری ہے جو ملا اسلام پر ثابت کرتا ہے۔ اسلام میں یہ ٹھیکیداری نہیں ہے۔ اسلام سیکھنا ہو تو سردار صاحب کے پاس سے سیکھو۔ اس لئے کہ وہ جلسہ یوم عالم اسلام کے صدر ہیں۔

” اور آج یہاں یوم عالم اسلام منایا جا رہا ہے۔“

اس جلسے میں اسلام کے کچھ نمائندے بھی شامل ہیں جو اسلام کو ذاتی جاننا سمجھتے ہیں۔ اسلام کے ان سپوتوں کے سامنے اسٹیج پر جاہلیت اپنا ناچ دکھاتی ہے۔ اسلام کے اہم معاشرتی پہلوؤں پر

حلے کرتی ہے۔ لیکن یہ احمد بن حنبل کے ماتھے والے، یہ ابوحنیفہ کے
کے مسلک کے دلدادہ، دم سادے، چپ چاپ، خاموش بیٹھے رہتے
ہیں۔ حق ان کے سامنے ذبح ہوتا رہتا ہے لیکن ان کی رگوں کا خون سرف
رہتا ہے اور ان کا دل پورے اطمینان سے سینے میں دھڑکتا رہتا
ہے۔

یہ اسلام کے محافظ ہیں۔ یہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی سی حیثیت
رکھنے کے دعویدار ہیں۔ لیکن مصلحت ان کے منہ پر تالے لگائے رکھتی
ہے، جاہلیتِ قہقہے لگاتی ہے اور یہ سر جھکاٹے تاریکی میں آلی
شکلی ہوتی چمکا دڑوں کی طرح اپنی بے حسی پر قائم کرتے رہتے ہیں
شائد انہوں نے اپنے ضمیر سے کہہ دیا ہوا ہے کہ تو ہر اقتدار کے
سامنے جھک جایا کر۔

آہ! آج یہاں یومِ عالمِ اسلام منایا جا رہا ہے۔
یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ مسلمان ہی اس میں بولنے والے
ہیں۔ مسلمان ہی اونچے ہیں اور وہی نیچے ہیں۔ مسلمان جس کا ایمان
ہے کہ وہ برائی کو بزورِ روکتے یا کم از کم علی الاعلان رو کرنے
پر مامور ہے۔ یہ وہی مسلمان ہے جس کے سامنے اسلام کا
مذاق اڑایا جا رہا ہے اور مذاق وہ اڑاتے ہیں جو انہیں مسلمانوں
کے آگے بڑھانے سے آگے بڑھے ہیں۔ انہیں کے اوپر
اٹھانے سے اوپر اٹھے ہیں۔ انہیں کے نعروں اور انہیں کی

قربانیوں سے اوسچھے بنے ہیں۔ لیکن اسلام کے ان پیروؤں کی زبانیں
گنگ ہیں۔ اور اسلام کی ترقی کے لئے ہر شخص نے اسے ذبح
ہونے کے لئے اپنے ہی قصا بوں کے اہتوں میں دے دیا ہے۔
آہ۔ یہ سب اسلام کے پیرو ہیں اور بھول گئے ہیں کہ انہیں
ایک دن خدا کے سامنے حاضر بھی ہونا ہے۔ ان کے لئے یہ
کیا کم ہے۔

• کہ آج یہاں یوم عالم اسلام منایا جا رہا ہے۔



یہ مہینا بازار ہے

لوگ جوق در جوق پارسی جم خانہ کی طرف جا رہے ہیں۔ بہت
 بھڑ بھاڑ ہے تین تین فرلانگ لمبی قطاریں کھڑکیوں کے سامنے
 ٹکٹ کی منتظر پورے صبر و سکون سے کھڑی ہیں۔ اس قوم کے افراد
 کے صبر و استقلال کا مظاہرہ سینما کی کھڑکیوں کے سامنے ہوتا ہے
 یا ایسے ہی میلوں اور نمائشوں کے افتتاح پر۔ خوشبودوں میں
 بسے ہوئے بنے سنورے ٹہلتے ٹہلاتے اس قوم کے نوجوان افراد
 چلے جا رہے ہیں۔ کچھ ٹیلوں میں اور کچھ ساریوں میں بظاہری شکلوں
 میں کچھ نمایاں فرق نہیں ہے۔ زندگی کی تلخیوں کو۔ مٹھائیں مٹھا لوں۔
 سڈول جھوں اور بولتی آنکھوں میں گم کرنے کے لئے یہ سارا
 ہجوم ہے۔ یہاں مغل جاہلیت کے دور کا اقتحان ہو رہا ہے یہاں
 حسین اور مہذب خواتین دکائیں لگاتی ہیں۔ سووے کرتی ہیں اور
 اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لوگ جوق در جوق پارسی
 جم خانہ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کی سرپرستی
 میں جاہلیت اور فحاشی نے یہاں ایک نیا اڈہ کھولا ہے

یہ مینا بازار ہے۔

عوام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ مینا بازار بارہ بجے دن سے
 بارہ بجے رات تک کھلے گا۔ ریڈیو پیج پیج کر مسلمان عوام کو وہاں
 آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اخباروں نے اپنے کالم اس
 جاہلیت کے اعلان و فرودغ کے لئے وقف کر دیئے ہیں۔ ریڈیو
 نے اپنے اوقات میں اس اہم فریضہ کے اعلان اور اس کی تفصیلاً
 کو جگہ دے رکھی ہے۔ لوگوں میں چرچا ہو رہا ہے کہ وہاں بڑی
 اچھی اچھی چیزیں ہیں اور چیزوں کا مفہوم ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
 لے آتا ہے۔ مسکراہٹ اور گدگدی بار بار جانے کی آگاہی کے
 ساتھ۔ آخر ایک روپیہ ہی تو ٹکٹ ہے۔ شہر کے بہترین چہرے
 بہترین بلوسات میں بہترین اداؤں کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیے
 ہیں۔ حوصلہ ہو تو جا کر دیکھ لو۔ ایک انبوہ جمال اور ہجوم رنگ و بو اور
 پھر ریڈیو بھی تو پیج پیج کر کہہ رہا ہے کہ یہ انوکھا بازار بارہ بجے دن سے
 رات تک کھلا رہے گا۔ یہ ریڈیو بے وجہ کھوڑا ہی پیج
 رہا ہے۔ عوامی تربیت کا یہ بھی تو ایک بہترین آلہ ہے۔ اور
 جو بھی اس پر قابض ہو گا وہ اپنے ذوق کے مطابق اس سے عوام
 کی تربیت کا کام لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو پیج پیج کر بارہ
 بجے دن سے بارہ بجے رات تک کھلنے والے مینا بازار

کا اعلان کر رہا ہے۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ ماحول بنایا جائے۔ اس لئے کہ حکومت نے اعلان کر دیا ہے کہ اس کے قانون کی بنیاد قرآن و سنت پر ہوگی۔ اور عوام کو بھی اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق زندگی کو ڈھال سکیں اور زندگیوں کو بچھلتی چلی جا رہی ہیں۔ شام کے انگریزی اخبار نے یہ اعلان کیا ہے کہ تیس ہزار شہریوں نے ایک دن میں مینا بازار کا حج کیا۔ گویا تیس ہزار شہریوں نے ایک دن میں مینا بازار کی اسلامی تربیت گاہ کا کورس پاس کر لیا ہے۔ دیکھئے کس سرعت سے ماحول تیار ہو رہا ہے۔ تیس ہزار افراد اسلامی حکومت کے شہری بننے کی تربیت پا گئے۔ اس تربیت گاہ میں تربیتی سامان بھی بہت کافی ہے۔ حسین چہرے پر رونق آنکھیں، گلابی ہونٹ، چست بلبوسات، مضطرب ادائیں جوڑے کے اڈے، فقرے بازیاں، رکیک حملے، بے حیائی اور بے شرمی کی باتیں، شراب کے فروخت ہوتے ہوئے جام، قوم کی ساتی گرمی کرنے والی بیٹیاں، خوشبوئیں، تھر تھر ہنسیں، چلبلا پن اور اشارے بانڈیاں۔ مینا بازار کی تربیت گاہ نہوروں پر چل رہی ہے۔ پوسٹاں تربیت پاؤں کے زبردہ تمام دی جا رہی ہے۔ اکابرین کی بیگیاں رہنمائی فرما رہی ہیں۔ خود اکابرین ملت بھی بھٹتے اور ان کے لئے

تشریف لارہے ہیں۔ ماحول تیار ہو رہا ہے۔ حکومت نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ عوام کو قرآن و سنت کے مطابق زندگیاں ڈھالنے کے مواقع مہیا کرے گی اور وہ مواقع مہیا کئے جا رہے ہیں۔ یہ مینا بازار ہے۔

یہ مینا بازار ہے۔ آپاؤں نے مسلمان عورتوں میں ترقی اور روشن خیالی پھیلانے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مسلمان ملک کو دنیا کے مہذب و متمدن ممالک کے سامنے شرمندگی خفیت و وقیانوسیت کے الزام سے بچا لیا ہے۔ ان کے دم قدم سے یہاں کا مسلمان معاشرہ بے رونق اور بے روح نہیں ہے۔ ان کے مینا بازاروں سے معاشرے میں نئی روح دوڑا دی ہے۔ آپاؤں کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں بھی حکمت حسن کا انتخاب ہوتا ضروری ہے تاکہ دنیا کی متمدن قوموں کے درمیان ہم سر بلند ہو کر چل سکیں اور ناک اونچی کر سکیں۔ اسلام کے نام سے ان کا سرنگوں ہوتا ہے اور بخش کاری اور حسن کی نمائش سے ان کا سر بلند ہوتا ہے۔ یہ مسلمان عورت کو قدامت اور شرم و حیا کے پردے سے نکال کر کلب کی روشنی میں لانا چاہتی ہیں۔ اسی لئے یہ مینا بازار دکھایا گیا ہے تاکہ اسلامی ثقافت پھلے پھولے اور ترقی کرے اور ملک و دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے۔ اسی لئے یہ مینا بازار سجایا گیا ہے اور اس میں کیا شہ ہے کہ جدید اسلامی ثقافت کا سب سے بڑا منظر یہ مینا بازار ہے۔

چند اہم اسلام

میرے براہِ عزیمت مستقبل کے پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے تصور سے
 تیز ادل مسرت سے معمور اور ذہن حسین تصورات سے مالا مال ہے
 لیکن تیرے چہرے سے کبھی کبھی غم و اندیشہ کے بادل بھاؤں کے
 ابر پاروں کی طرح پرچھائیاں ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہیں جنہیں میں دیکھتا
 ہوں اور خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تیرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ تو
 جب اپنے ملک کے سربراہوں کے وعدوں کو دیکھتا ہے تو تیرا چہرہ
 مسرت سے تانناک ہوتا اور سروکار سے بلند ہو جاتا ہے اور جب انہیں
 وعدوں کو کتابِ عمل میں پڑھتا ہے تو چہرہ غم و اندوہ سے مزین اور
 سردامت سے ٹھیک جاتا ہے۔ غم نہ کر کہ میں بھی اس غم میں تیرے ساتھ
 برابر کا شریک ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ تو اندیشوں سے حیران و پریشان
 ہے اور میں تغیر و انقلاب کے عزائم لیتے مرکبِ حالات پر پابند کتاب
 ہوں۔

تیرے ملک میں اسلامی وعدوں کے نقوش کتابِ عمل کے صفحات
 پر کس طرح ابھر رہے ہیں۔ اس کی جھلکیاں دیکھنے کی ہمت ہو تو میری رہنمائی

میں آتا کہ میں تجھے ملک کے طول و عرض میں امانت دے رہے ہوں اور گردش کرتی ہوئی آندھیوں کا نظارہ دکھاؤں تاکہ تو دیکھ سکے کہ تیرے ملک میں جدید اسلام کس طرح نافذ ہو رہا ہے۔

یہ دیکھ بارہ سو پہلے دور تیرے ملک کے دوسرے حصے سے اسلامی ثقافت کے مظاہروں کے لئے ایک وفد آیا ہے۔ اس میں نوجوان لڑکے تیرے عزیز بھائی۔ اور نوجوان لڑکیاں تیرے ملک کی محترم بیٹیاں ہیں جو اسلامی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہوئے ملک بھر میں پھر رہے ہیں۔ جبکہ ناچ رنگ کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں۔ ملت اسلامیہ کی یہ بیٹیاں اپنے فن کا مظاہرہ کس طرح کھڑک کھڑک کر کر رہی ہیں۔ فصلی ناچ۔ چلی ناچ اور ناگ ناچ ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی رقص ہے۔ اسلامی فن کار ہیں اور ان کے اسلامی فن نے پورے ملک میں دھوم مچا دی ہے۔ ہماری اسلامی ثقافت سر بلند ہو رہی ہے اور جدید اسلام ملک میں نافذ ہو رہا ہے۔

یہ اور منظر سامنے ہے۔ بڑے بڑے معزز لوگ تشریف رکھتے ہیں گیلریاں نوجوان اور آراستہ پیراستہ تماشائیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں عورتیں ہیں۔ مرد ہیں۔ نوجوان ہیں۔ زندگی سے معمور اور عزم و اہم سے بھرپور ہیں۔ سامنے میدان میں ملت کی نوجوان بیٹیاں میچ کھیل رہی ہیں۔ رصنیہ کھڑکتی ہوئی دوڑتی ہے۔ رخشندہ لاپتی ہوئی گرتی ہے۔

تنگ لباس، حشیت جمیر کمری کسی ہوئی۔ یہ جہاد نہیں ہو رہا ہے بلکہ ترقی کی دوڑ میں پاکستانی قوم کی یہ بیٹیاں دوسری قوموں کے دوش بدوش چل رہی ہیں۔ چل مہین رہیں بلکہ دوڑ رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کو ان کے کھیلوں سے زیادہ ان کی حرکات سے دلچسپی ہے۔ اس طرح پاکستانی ملت اپنی بہو بیٹیوں کو ترقی کی دوڑ کے لئے تیار کر رہی ہے۔ نماشاہی سنس رہے ہیں۔ سما لیاں پیٹ رہے ہیں اور اسلامی ترقی کے ان مظاہر پر مسترت کے نعرے بلند کر رہے ہیں اس لئے کہ ملک میں جدید اسلام نافذ ہو رہا ہے۔

کلب کی فضا رونق سے چمک رہی ہے۔ رات کے بارہ بجے ہیں مسلمان صاحب اور مسلمان بیگمات نہر طرف سے پہنچ رہی ہیں صحن صحن میں قناتیں لگی ہیں۔ باجہ دھیمے سروں میں بچ رہا ہے۔ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ پاکستانی ملت کے افراد جو لالہ کے نعرے پر یہ ملک حاصل کر کے آئے ہیں۔ مردوزن بانہوں میں بانہیں ڈالے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے مجھوم مجھوم کر باجے کی دھیمی تان پر مست ہو ہو کر مخمور آنکھیں اور مد ہوش حرکات لئے ڈول رہے ہیں۔ رقص کر رہے ہیں۔ رات کا ایک بج گیا ہے۔ اب دو بج رہے ہیں۔ شراب کا دور چل رہا ہے۔ بتیاں بھتی ہیں علتی ہیں۔ چہرے تہمتائے ہیں اور بیخود ہوتے ہیں۔ پاکستان کا اسلامی کلچر پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ وہ کلچر ہے جو

نئی قوم کے لئے تخلیق کیا جا رہا ہے تاکہ یہ کلچر اسلامی تہذیب کے سارے ہی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اپنی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یہ سارا ہنگامہ برپا ہے۔ قدیم کلچر میں سے ترقی کی نئی راہیں نکالنا پڑا مشکل کام ہے اور وہی مشکل کام ہو رہا ہے۔ اس طرح اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے راہیں ہموار ہو رہی ہیں اور اس میں کیا شک ہے کہ ملک میں جدید اسلام نافذ ہو رہا ہے۔

میرے عزیز رفیق سفر تو مڑ مڑ کر کیا دیکھ رہا ہے کیا تجھے گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر مرحوم حسین بی بی کی لاش کا تصور سار رہا ہے۔ یا ملت کی اس مظلوم بیٹی کے رائیگاں جانے والے خون کی یاد آ رہی ہے یا اس وقت کے وزیر اعلیٰ صاحب کے بلند بانگ دعوے یاد آ رہے ہیں یا پھر رحیمیاں بی بی کے فریادی چہرے نے تجھے پریشان کر دیا ہے۔ تو حیران ہے کہ جو قوم دس لاکھ امرا دکھڑا کر ایک بھاری عزم اور عہد کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ کیا اسے یہاں آکر یہی کچھ کرنا تھا، یا تو اس لئے حیران ہے کہ اسے غیر مسلم غنڈوں کے مقابلے میں مسلم غنڈے پسند تھے۔ اس لئے اس نے اپنا علیحدہ گھر بسایا تھا یا تو روزانہ اخباروں میں قتل و غارت گری اور اغوا و بد اخلاقی کی وارداتوں سے پریشان ہو گیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو تیری یہ حیرانی اور پریشانی بے سبب نہیں ہے۔ لیکن محترم بھائی مجھے پریشان ہونے

کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صورت حال صرف اس لئے تیار کی گئی ہے تاکہ قوم کے اندر کی ساری برائیاں اس کے اندر سے بالکل باہر نکل آئیں۔ اور اس کے اندر مزید کسی برائی کے داخل ہونے کے لئے گنجائش باقی نہ رہے۔ یہ کام ہماری قوم اس لئے کر رہی ہے تاکہ بہتر فضا تیار کرنے کے لئے زمین ہموار ہو سکے اس لئے کہ اس ملک میں جدید اسلام نافذ ہونا ہے۔

میرے بھائی ایسے ملک میں ہو سکے تو سیاست کی وادی پر پتھر میں کبھی قدم نہ رکھنا اس لئے کہ یہ وادی صرف چند برہمنوں نے اپنے لئے وقف کر لی ہے اور پوری قوم کی حیثیت ان کے مقابلے میں شور کی ہے۔ سیاست کی تک رسوخ کے لئے یہاں مخصوص قسم کے اخلاق اور ضمیر اور مزاج کی ضرورت ہے جو نیگلوں میں پرورش پاتا۔ اہد جوڑ توڑ کے ماحول میں پر دان چڑھتا ہے۔ یہاں کی مارکیٹ میں سب سے کم حیثیت اور بے حقیقت شے اصول پرستی ہے۔ یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے ضمیروں کے سوسے ہوتے ہیں۔ لوگ راتوں رات ضمیر بیچ کر کہ سبیاں خرید لیتے ہیں۔ لوگوں کو اسلامی نظام کے لالچ دے کر انہیں گھیر کر مارکیٹ میں لے جا یا جاتا ہے اور وہاں بے حقیقت ووٹوں کے عوض بیچ دیا جاتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے معززین سیاست صبح وعدہ کہتے ہیں اور شام کو توڑتے

ہیں اور رات کو سونے سے پہلے پھر ایک نیا وعدہ کرتے ہیں اور صبح کو آنکھ کھلتے ہی اس سے بھی انحراف کا اعلان کر دیتے ہیں یہ سب کچھ عوام کی خدمت کے لئے کیا جاتا ہے۔ وعدوں کے یہ کاروبار کر شیوں کے عوض ہوتے ہیں تاکہ اسلامی نظام کا راستہ ہموار ہو سکے اس لئے کہ اس ملک میں جدید اسلام نافذ ہو رہا ہے۔

میرے دوست یہاں اونچی اونچی بارگاہوں میں رشتوں کے تدارک اسی عقیدت سے پیش کئے جاتے ہیں جیسے پیروں کے سامنے مریدوں کی نذرین جاتی ہیں۔ یہاں نقدی کے ساتھ آبرو دین بھی نذر کی جاتی ہیں۔ موٹریں اور ننگے نذر ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ حجے میں ہار کر بھی نذر پیش کی جاتی ہے۔ یہاں اونچے ننگے ان آدمیوں سے بن جاتے ہیں جن کا حساب کسی کھاتے میں درج نہیں کیا جاتا۔ یہاں ”ہذا من فضل ربی“ کے کتبوں کے ساتھ ایسی عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں جن کے گارے کے لئے خریبوں کا لہو اور مسکینوں کا رزق کٹ کر آتا ہے۔ جن کی اینٹیں مققداروں کی ہڈیوں سے بنتی ہیں اور حج کا جوڑ بھی اسلامی مملکت کے حدود کے اندر ایک تکلیف دہ ناسور اور ایک ناپاک غلاظت سے بدتر ہوتا ہے لیکن اس میں روزا فزوں ترقی اس لئے ہو رہی ہے کہ یہاں جدید اسلام نافذ ہو رہا ہے۔

میرے ہم وطن تیرے اس ملک میں بڑے بڑے ذہین لوگ بستے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں اس وقت ملک کی عزت و آبرو ہے۔ یہ ملک اسلام کے تصورِ جداگانہ قومیت پر قائم ہوا ہے اور اسی تصور پر یہ قائم ہے لیکن اس کے محافظین کا یہ عالم ہے کہ وہ جب جلسوں میں آتے ہیں تو عوام کو اپنی جداگانہ قومیت کا یقین دلاتے ہیں اور جب اسمبلیوں کے اندر اپنے ہم مشرب لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں تو انہیں یقین دلاتے ہیں کہ غیر مسلم اور مسلم کا ہمارے نزدیک کوئی سوال نہیں ہے ہم ایسی تنگ نظریوں سے بالاتر ہیں اور "من تو شدم تو من شدمی" ہمارا اصول ہے اس لئے کہ ہم تنگ نظر ملا نہیں ہیں اور وہ تنگ نظر ملا جو یہ بات بار بار دہرا رہا ہے کہ اسلام نے کافر و مسلم میں فرق کیا ہے وہ کیا جانتا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اس لئے کہ جدید اسلام ہم ہی بنائیں گے۔ اور ہم ہی اس کے اسرار و معارف سے واقف ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام جدید تقاضوں کے ساتھ یہاں نافذ ہو رہا ہے۔

عزیز دوست ملک کے ان حالات کو تو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ ملک ترقی کی کیسی کیسی منزلیں مار رہا ہے۔ اس ملک میں ایسے ایسے اسلام کے پابند اور ذمہ دار ترین افراد ہیں جو قوم کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس خدمت کے سبب ان پر لاکھوں روپوں کے ہیر پھیر کے الزام آتے اور بیسیوں متعقدے چلتے ہیں تو وہ پردہ تک نہیں کرتے

انہی رات ان پر سنگین تک کے الزامات لگاتے ہیں لیکن وہ جواب
 چاہتا ہے یا شد نموشی کے اصول پر مہارت صبر و سکون کے ساتھ مسلسل
 حرام کی خدمت کئے چلے جاتے ہیں۔ نہ انہیں کسی سے گلہ ہے۔ نہ
 کسی پر انوس ہے صبر و تحمل اور ضبط نفس کے یہ محبتے خاموش
 رہ کر اپنا فریضہ خدمت ملت ادا کئے چلے جاتے ہیں۔ ایسے نہیں
 اس قحط الرجال کے زمانے میں اس لئے سامنے آ رہے ہیں کہ ملک
 میں انہی حضرات کے ہاتھوں جدید اسلام نافذ ہو رہا ہے۔

عزیز ہمسفرانہ بد دل ہو اور نہ حیران، صرف حالاتِ زمانہ کی اس
 فلم کو دیکھ جو تیرے ملک کے صاحب اختیار لوگ تیرے سامنے
 چلا رہے ہیں اور اس فلم میں خود بھی ادا کار بنے ہوئے لٹے کر واروں
 کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ تیرے سامنے ریس کا میدان آ گیا ہے
 جس میں جا کی گھوڑوں پر سوار مستعد اور ہوشیار بیٹھے ہیں۔ تماشائی
 گیلریوں میں تیرے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے بھی موجود ہیں
 اور بڑھ بڑھ کر بازیاں لگ رہی ہیں۔ ہزاروں کے وارے نیالے
 ہو رہے ہیں۔ اس طرح جوئے کے اس وسیع کاروبار کو چلانے کے
 لئے اور اس معصوم تفریح میں حصہ لینے کے لئے رشتوں کا جال
 اکاس بیل کی طرح قومی وجود کے چاروں طرف پھیل گیا ہے۔ تو
 کیا جانتا ہے کہ اس ریس کے کاروبار کو چلتا رکھنے کے لئے دیہات

کے معصوم کسان تک کی جیب کاٹ لی جاتی ہے۔ بہر حال تعمیر سے ملنے
 یہ اطمینان بہت کافی ہے کہ اس ملک کے حکمرانوں نے جدید اسلامی دستور
 کے نفاذ کا تہیہ کر لیا ہے اور اب یہاں جدید اسلام نافذ ہو رہا ہے۔

سنگی اور عریاں تصویروں کے اس چلنے پھرنے نگر خانے کو پورے
 ملک کو دیکھنے کی ضرورت نہیں جو سینما ڈوں کے اشتہارات بن کر
 گلی کوچوں میں کارواں در کارواں پھرتا رہتا ہے۔ ایک طوفان بدتمیزی
 اٹھاتا ہوا۔ رنگ برنگ کے پونڈوں کے ساتھ عملی مظاہرے تصویروں
 میں پیش کئے جاتے ہیں اور بازار سے گزرنے والے ہر مرد و عورت
 اور بچے کو بتایا جاتا ہے کہ ملک کو کدھر جانا چاہیے۔ گالوں کے
 علماء اور ادب باش نوجوان اس رواں دواں ناچ رنگ اور موسیقی کے
 کاروانِ شرتال پر سر دھنتے ہاتھ جھٹکتے اور بدن لہراتے ہوئے
 چلتے ہیں۔ یہ وہ نئی نسل ہے جو ملک کے اندر ایسی تربیت گاہوں
 کے ایک وسیع جال میں تربیت پا کر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور
 ظاہر ہے کہ اسے ایسی ہی تربیت دینے کا انتظام کرنا ضروری
 ہے کیوں کہ ان پر آئندہ چل کر بھاری ذمہ داریاں عائد ہونے
 والی ہیں اور اب اطمینان رکھ کہ اس ملک میں جدید اسلام
 نافذ ہو رہا ہے۔

تیرے لئے یہ کیا کم خوشی کا مقام ہے کہ تیرا لیدر طبقہ خدا اور
رسول کی وفاداری کا عہد کرتا ہے اور قرآن و سنت کے مطابق
اپنے ملک کے باشندوں کو لئے چلنے کا دعویٰ کرتا رہتا ہے یہ
انگ پات ہے کہ دستور سازوں کی سرپرستی میں یہاں ایسے ادارے
بھی چل رہے ہیں جن کو مالی امداد تک دی جاتی ہے کہ وہ اپنے
عوام میں خدا سے عقلمندی اور رسول کی سنت سے ہٹ کر چلنے
کو فیشن بنا دیں۔ یہاں اسلامی ثقافت کے نام پر اسلامی اقدار
کی جڑیں کھودنے کے لئے باقاعدہ تحقیقی کام کئے جاتے۔ رسائل نکلتے
اور کتابیں طبع کی جاتی ہیں۔ اس اسلامی نظام چاہنے والے ملک
میں رسول کی سنت کے خلاف باقاعدہ ادارے چلائے جا رہے
ہیں اور ان کو بڑی اونچی بارگاہوں کی سرپرستی حاصل ہے اور یہ
سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ہمارے ملک میں جدید اسلام
نافذ ہو رہا ہے۔

عزیز ساتھی تجھے یہاں جمہوریت بہت خطرے میں نظر آرہی ہے تو
انتخابات کا بار بار ذکر کرتا ہے کہ ملک کے وجود میں آنے کے بعد ایک مرتبہ
بھی آزادانہ انتخابات نہیں ہوئے اور نہ مستقبل قریب میں ہونے کا
امکان ہے۔ تو نے جو چھوٹے چھوٹے انتخابات دیکھے تو ان سے
اندازہ کیا کہ یہ انتخابات نہیں ہیں بلکہ ظلم و تشدد، جبر و زیادتی،

ضمیر فرشتی اور دھونس، دھوکا، دھاندلی، دشنام اور دھن پہاڑ بہ پہاڑ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انتخا بات میں حصہ لینا ایک شریف آدمی کے لئے بالکل ناممکن بنا دیا گیا ہے اور اب یہ کسی بھلے آدمی کے بس میں نہیں ہے کہ اپنے روایتی آدابِ شرافت و سنجیدگی کو ساتھ لے کر انتخا بات میں حصہ لے سکے۔ اب یہاں بٹوں کے مالک اپنے مزدوروں کی بانتخواہ ٹیمیں لے کر ان انتخا بات میں کودتے ہیں اور تو اس پر اس لئے جی حیران ہے کہ یہاں اسلام لائے کا وعدہ ہو رہا ہے لیکن میرے دوست اگر زندگی کے انقلابی مراحل سہولت اور تن آسانی سے گزر سکتے تو تجھے میدانِ جہاد کا اجر کہاں سے ملتا۔ تجھے جنینِ دہر کے معرکوں کی شدت کا احساس کیسے ہوتا۔ اب تو صورتِ حال اپنی بشارتی تلخ حقیقت کے ساتھ تیرے سامنے ہے کہ شیطان اپنا تخت بچھانے کے لئے اپنے سارے ہتھیار استعمال کر رہا ہے اور قوم پہ خواب دیکھنے میں غور ہے کہ یہاں اسلام ناقذ ہو رہا ہے۔

عزیز دوست، الفاظ کے اس بے روح ڈھانچے میں تیری رگوں کا خون ہی گرمی اور زندگی پیدا کرے گا۔ زمانہ اور خدا کے فرشتے تجھ سے ایسی ہی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔



ایک مقدمہ

آخرت کی عدالت میں ایک ملت کے مقدمے کا تصور میرے ذہن میں ابھرا
جن میں قائد اعظم اور علامہ اقبال کے نام نمایاں تھے۔ اس سب سے
اور نیچی بارگاہ میں جہاں ہر بلندی پست ہے اور ہر بڑائی نوار و زبولی ہے
ان حضرات سے ایک نئے نئے مسئلے کے متعلق کوئی سوال پوچھا جانے والا تھا۔ وہ
سوال بھی میرے ذہن میں اسی طرح گونجا تھا جیسے کسی نے پکار کر سنا دیا
ہو۔ وہ سوال ارض پاک کے مقصد و وجود کے متعلق تھا۔ اس کے مقصد و وجود
کے تعین کی گواہی خدا کے بے شمار فرشتوں کے ساتھ علامہ اقبال بھی
دینے والے تھے۔ غالباً وہ گواہی یہ تھی کہ ارض پاک کے وجود کا مقصد
اللہ کی حاکمیت کا قیام تھا۔ دین اسلام کو سر بلند کرنا تھا۔ ہر بلندی سر
سے نہیں بلکہ غلبہ سے ممکن تھی۔ خدا اور اس کے رسول کو قانون کا
مستحق قرار دینا مقصود تھا۔ اس جواب طلبی میں بڑے صخب کے طول و عرض
سے پوری ایک ملت انسانوں کے گرد ہوں گے گروہ گواہی دینے
کے لئے آ رہے تھے جو اپنا خون بہا اور قصاص طلب کر
رہے تھے۔

پانچ دریاؤں کا پورا علاقہ الٹ کر آ گیا تھا۔ بنگلہ دیش کا پورا
 جنوب آ گیا تھا۔ ماؤں کی جھولیوں میں شیرخوار بچوں کے کٹے ہوئے
 سر تھے، باپوں کی گودوں میں نیزوں اور برچھوں سے چدے ہوئے
 لاشے تھے۔ ملت کا لٹا ہوا تار اپنے دامن میں بوڑھوں کی اڑتی
 ہوئی سفید ڈاڑھیاں لایا تھا۔ ملت کی جیا اپنے سینے پر لٹی ہوئی
 عھمتوں اور آبروؤں کے زخم لائی تھی۔ خون کے دریا آتے تھے لٹتی
 اور حلقی ہوئی جا تادیں آئی تھیں۔ بیاس کے پاس کٹنے والے اور
 سیلاب میں غرق ہونے والے کمزور و نحیف قافلے آتے تھے بکپوں
 میں مرنے والوں کے ڈھانچے آتے تھے اور نہ معلوم کیا کیا کچھ آ یا تھا۔
 دکھ درد ذلت و تباہی ان کی پیشوائی کر رہے تھے اور عدالت الہی میں
 جواب طلبی ہو رہی تھی۔ جرح یہ تھی کہ اگر اس خطے کو حاصل کرنے کا مقصد
 اللہ کے دین کی سر بلندی تھا تو یہ سب کچھ تو اب تھا یہ سب کچھ حسین و علی
 متاع کی شکل میں قائد کے نامہ اعمال میں ڈال دیا جانے والا تھا اور اگر اس
 کا مقصد چند اشخاص کی خدائی قائم کرنا تھا۔ ملت کو لوٹ کر چند افراد کے
 گھر بھرنا تھا۔ امت محمدی کے خون سے چند عیاشوں کے باغ عشرت
 سینچے جانے مقصود تھے تو یہ سب کچھ ایک بھیانک انار محصیت کی
 شکل میں بیچارے قائد کی میران عمل میں ڈال دیا جانے والا تھا۔
 یہ مقدمہ بڑا ہی خوف ناک اور عبرت ناک تھا۔ قائد کو اپنی
 برائیت کا اظہار کرنا تھا۔ وہ انگلیوں پر ان لوگوں کے نام گن رہا تھا۔

جو اس کے لفٹنٹ تھے لیکن جنہوں نے اس کی غیر موجودگی سے نا جاہز قائدہ اٹھا کر نیکی کے دھارے کا رخ پھیر کر اسے اپنی خواہشات کی گدڑی نالی کی طرف بہا دیا تھا۔ جنہوں نے لا الہ الا اللہ کا مطلب اپنے عمل سے اپنی خدائی قرار دیا تھا۔ جنہوں نے اسلام کا نام لے کر کفر کے جھنڈے لگاڑ دیئے تھے اور اسلامی معاشرت کا نام لے کر ثقافتی تہذیب کی رقص گاہیں تیار کر دی تھیں تاکہ شرم و حیا اور عصمت و غیرت کو سرحد پار کر دیا جائے۔ جنہوں نے قوانین کے ذریعے قرآن و سنت کے اسلام کا لگہ گھونٹ کر اسے مسجدوں کے حجرہوں میں مقید کرنے کی ٹھان لی تھی تاکہ اپنا جدید سانحہ یورپ اسلام نافذ کر سکیں۔

قائد اپنی مدافعت میں جو کچھ پیش کرنے والا تھا وہ اگر ارض پاک کی موجودہ تباہت سن لے تو شاید قائد پر بھی سلفی قوانین کا پھندہ ڈالنے کے لئے دوڑ پڑے۔



اپنی کی آمد

زمینی سانچہ جا ہتھیت سے ثابت ہونے کے بعد نئے ڈھب پر
لکھنے سے گھبرا رہا تھا۔ جہاں انکار میں ایک شدید توڑ پھوڑ کے بعد
جو طبع پڑا تھا میرے تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ پھر کسی نئی عمارت
کی شکل اختیار کر سکے گا۔ یہاں پہلے ایک کاسموپولٹین قسم کا کلب تھا
پر قسم کے کردار اس میں آتے جاتے تھے۔ اب اس کلب کو میں نے
ڈھا دیا تھا۔ اس توڑ پھوڑ کے بعد میرا ادبی وجود تقریباً بے گھر سا ہو گیا
تھا۔ پیچھے کے راستے مسدود تھے۔ آگے کوئی راہ نہ تھی۔ پیچھے خاردار
جنگل لگ گیا تھا۔ آگے کوئی گنڈ نڈی نظر نہ آتی تھی۔ میں حیران اور
ششدر کھڑا تھا اور گمان ہو رہا تھا کہ وہ ادیب مر گیا جو اس کلب
کا روح رواں تھا۔ اور چونکہ مرنے والا اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑ گیا
تھا۔ اس لئے اب کسی نئی تعمیر کے کوئی امکانات نظر نہ آتے تھے۔
یہ انہیں دنوں کی بات ہے کہ میرے ذہن میں ایک تیشیچہ

اُبھرا۔

چین میں اشتراکی انقلاب مکمل ہو گیا تھا۔ چیانگ کائی شیک دم

توڑا تھا۔ اشتراکیت نے پورے چین کو اپنے دامن میں لے لیا تھا۔
اس طرح شمال کے ساتھ مشرق سے بھی اشتراکیت آلود ہوا میں چلنے
لگی تھیں۔

اشتراکیت شاداں و فرحاں ہواؤں کے دوش پر ایک فاسخ کی
حقیقت سے آگے بڑھ رہی تھی۔ چین سے ایک تند و تیز جھوٹکا آیا جن
پر کمیونزم سوار ہو کر آیا تھا وہ اپنے عالم تصور کے آئندہ مفتوحہ
ممالک کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس جھوٹکے کے دوش پر
برما اور رنگون کی سیر کی تھی۔ آسام کے جنگلوں میں بھٹکا تھا۔ ملائیا کے
ریڑ کے جنگلات میں گوریلا وار لڑنے کے منصوبے بنائے تھے۔
بھارت میں تلنگانہ کا جائزہ لیا۔ کیرالا میں ٹھہرا۔

مدراس کے دیہاتوں اور قصبوں کو کھنگالا اور ریاست رٹاون کور اور
کو چین کو اپنے لئے زرخیز پایا۔ آندھرا کے میدانوں میں تگ و تازگی
اور پھر اپنے ہوائی گھوڑے پر شمال مغرب کی طرف چلا۔

اچانک ایک دل دہلا دینے والے اور رگوں کا خون خشک کر دینے
والے حکم نے اسے مملکت پاک کی سرحد پر روک دیا۔

”یہ اجنبی کون ہے جو اس سرزمین میں داخل ہو رہا ہے؟“ آواز میں
سنجیدگی۔ وقار۔ پاکیزگی۔ متانت اور رعب تھا۔

”میں کمیونزم ہوں اور اپنے آئندہ مفتوح ہونے والے ممالک کا
دورہ کر رہا ہوں تو کون گستاخ ہے جس کی جان اتنی ارزاں ہے کہ

کیونکہ ہم کو روکنے کی سعی رائیگاں کر رہا ہے۔ ایک چنگھاڑ گرج پیچ اور چولنا کی کے امتزاج نے جواب دیا۔

میں اس سر زمین کا مالک ہوں۔ میں اس سر زمین کے فرزندوں کا دین ہوں۔ یہ سر زمین میرے ہی لئے حاصل کی گئی ہے۔ میں اسلام پر ایک پر عزم جواب تھا۔

” انفرادی ملکیت کا تصور میرے نزدیک سب سے بڑا جرم سے جو زمین پر سرزد ہو سکتا ہے۔ راستہ صاف کو میں آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کی نجات دہندہ ہوں۔ ورنہ سائبریا کے جہنم زاروں میں تجھے اور تیرے لادٹے فرزندوں کو اڑیاں رگڑانی ہوں گی۔“ شیطانی چنگھاڑ نے دھمکا دیا۔

” میرے عزیز دوست۔ راستے صاف نہیں ہوا کرتے اور ہوجائیں تو بہت جلد ٹپٹ جاتے ہیں۔ فکری راستے نظریات کی نتج سے صاف ہوتے ہیں۔ جس انسانیت کی نجات دہندگی کا علم تھے ہوئے تم آگے بڑھ رہے ہو اس انسانیت کو تم نے کیا دیا ہے؟“ اسلام نے پوچھا۔

” بوٹی“ جواب ملا۔

” بوٹی تو اس جہان کا ہر ذی روح کھاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک معمولی حیوان اور چوپایہ بھی تم نے انسانیت کو حیوانیت سے متیز کرنے کے لئے اسے کیا دیا ہے؟“ پوچھا گیا۔

” اس سے زیادہ مانگنا اور اس سے زیادہ سوچنا میرے نزدیک دلدادہ

انقلاب کے خلاف بغاوت ہے اور ایسے باغیوں کو مزہ کھاتا میں
 خوب جانتا ہوں۔ اور اب تم میرا راستہ چھوڑ دو۔ زیادہ شور نہ مچاؤ
 تم کسی بوڑھا تہذیب کے بوڑھے چوکیدار معاوم ہوتے ہو۔ کہا گیا
 "یہ ملک میری کھیتی ہے۔ میں نے اٹھی ابھی اس میں نیکی کا نظریاتی
 بیج بویا ہے۔ میں اس کا رکھوالا ہوں۔ میں اس میں کسی ناپاکی کو
 داخل نہ ہونے دوں گا۔ اپنے ملک کی حفاظت میں مرجانا میرے
 مسلک میں شہادت ہے اور شہادت وہ موت ہے جس کی تمنا
 میرے ہر فرزند کے سینے میں ہمیشہ پرورش پاتی رہتی ہے میں تمہیں
 حکم دیتا ہوں کہ واپس جاؤ اور اپنی ان پناہ گاہوں کو مضبوط کرنے
 کی فکر کرو جہاں میں نیکی کی فصل اگا کر اخلاق کے اسلحہ سے تم پر
 حملہ آور ہونے والا ہوں۔ جاؤ! ایک پر عزت آواز نے حکم دیا۔
 اور اجنبی واپس پلٹ گیا۔

اچھا میں اپنی مصلحت کے تحت ابھی واپس جانا ہوں۔ میں اپنے
 خفیہ دستے تیار کر کے یہاں دوبارہ بیخار کروں گا۔ میں اپنے جبری
 کمپوں کے لاکھوں مزدوروں کے ذریعے تمہاری اس کھیتی کو تباہت
 کروں گا۔ میں اس سرزمین کے فرزندوں کو آپس میں لڑاؤں گا۔
 ان میں ہزار اختلافات اور فتنے جگاؤں گا۔ پھر تم دیکھ لینا کہ زیادہ
 قومی کون ہے۔ اور کس کا سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے تمہاری
 یہ تعلق بندی اس روز ریت کی دیوار بن جائے گی۔ جانے والے نے کہا

پریشان اجنبی تمہیں اب تک فکر اور اصول سے بالا نہیں رہا ہے۔ صرف
 نٹروں سے وابستہ رہا ہے۔ تم نے قومیت کی چٹانوں کو توڑا ہے۔ لیکن
 تم اپنا ہتھوڑا کسی صالح نظریہ پر چلا کر اسے توڑ نہیں سکتے۔ اس کے
 لئے تمہیں نظریات کے میدان میں جیتنا ہوگا۔ جاؤ انتظار کرو۔ میں
 بھی منتظر ہوں۔ جب ہم ایک بار فیصلہ کن انداز میں متحرک آ رہے ہوں گے
 محافظ نے کہا۔

اجنبی خاموشی سے واپس جا چکا تھا۔ روحِ اسلام اپنی نظریاتی
 مہکت پر پہرہ سے رہی تھی۔



میرا دل چاہتا ہے

تلخ و تند جذبوں اور تیز و بے باک دلوں کا ایک ریلہ ہے کہ بارہا میں نے دل و دماغ کی وسعتوں میں گردش کرتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ کتنی ہی ان کہی باتوں کے تافلے میں نے دل کی وادیوں میں پریشان پائے ہیں اور کتنے ہی جا نماز اور جرمی خیالات میں نے ذہن کی تنگناڑوں میں گردش کرتے ہوئے محسوس کئے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی شوخ و سبکسار جذبے نے چاہا کہ میرے شعور کی آنکھ بچا کر زبان کی راہ سے نکل جائے یا قلم سے چھوٹ کر ٹپک جائے لیکن میں نے اسے ہمیشہ روکا ہے اور خیالات پر اپنی احتسابی گرفت ہمیشہ مضبوط رکھی ہے تاکہ کوئی سرکش خیال دل و دماغ کے قید خانے سے نہ نکل بھاگے۔ لا تعداد ہی جذبے ہوں گے اور بے شمار ہی دلوں ہوں گے جنہیں میں نے مدتوں نظر بند رکھا ہے اور وہ قلب و ذہن میں مدتوں دھو میں مچاتے رہے ہیں۔

بارہا میرا دل چاہتا ہے کہ ان جذبات کو الفاظ کے لباس پہنا پہنا کر دنیا سے ہست و بود میں آجانے دوں اور بارہا یہ سوچ کر

خاموش ہو گیا ہوں کہ اس رزمگاہ میں ایسے کھلاڑی اتر آئے ہیں جو شجاعت کی روح سے اتنے ہی عاری ہیں جتنے ان کے دل عیش و آرام کی تمنا سے بھر پور ہیں۔ ایسے نازک آگینیوں کو تو کسی نوکیلے لفظ کی ایک چھین بھی رلا سکتی ہے۔ یہ بھلا کسی تلخ نوائی کے کیا حریف ہوں گے۔ لیکن میرا دل ضرور چاہا کرتا ہے کہ کچھ کہوں اور اتنا چیخ چیخ کہ کہوں کہ پیرے بھی میری آواز کو پوری طرح سُن لیں۔ اور وہ بھی جنہوں نے حق کی طرف سے اپنی بصیرت کے کانوں میں انگلیاں دسے رکھی ہیں۔

بارہا میرا دل چاہتا ہے کہ ارضِ پاک کے حاکمِ اعلیٰ سے کہوں کہ اے خدا سے مطلق کے عاجز بندے جس دین کا تو نام لیوا ہے۔ اس کے پیروؤں میں تو ان بندگانِ خدا سے تو ضرور واقف ہوگا۔ جنہیں تاریخ ابو بکر صدیق اور عمر فاروق کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ^{واری} ^{ذمہ} کے لحاظ سے بھی تو اسی مقام پر کھڑا ہے جس پر وہ مقدس ہستیاں تھیں جو تاریخ کے دامن میں اپنی آب و تاب کے لحاظ سے بیش بہا موتی تھے۔ جب انہیں خدا نے اپنے لاکھوں بندوں پر اقتدار دیا تو انہوں نے کس طرح اپنے اختیارات کو استعمال کیا تھا۔ کس طرح ذمہ داری کے احساس سے ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں کس طرح انصاف اور اخوت و مساوات میں انہوں نے انسانی

تاریخ میں اپنی مثالیں قائم کر دی تھیں۔ کس طرح بڑی سے بڑی فتح کے موقع پر بھی انہوں نے غلاموں کو اذیتوں پر بٹھا کر اور خود اونٹ کی تکمیل تکمیل کر ثابت کر دیا تھا کہ اصل شوکت اخلاق اور تقویٰ کی ہے نہ کہ شان و شوکت اور بناوٹی شان و شکوہ کی۔ کس طرح انہوں نے بھرے گھنٹوں میں جاہلی سے جاہلی اعرابوں کے سخت سے سخت اعتراضات کا پوری نرم دلی سے جواب دیا تھا۔ کس طرح صداقت اور سچائی کی روح کو انہوں نے یہ کہہ کر فروغ دیا تھا کہ جب تک ہمارے درمیان ایسے حق گو لوگ موجود ہیں۔ ہمیں امت مسلمہ میں فساد کا خطرہ نہیں ہے۔ اور کس طرح بے لاگ تنقید کے موقعوں پر انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ اگر یہ حق بات ہے لاگ ہمارے منہ پر نہ کہیں تو ان میں خیر نہیں اور اگر ہم حق بات کو سکون قلب سے نہ سنیں تو ہم میں خیر نہیں۔

بارہا میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے وزراء سے کہوں کہ محمدی ثقافت کو ترک کر کے یہ تم نے کیا اختیار کر رکھا ہے۔

”جھومر —“

جو ان لڑکیوں کی دیدہ زیب قطاریں !
اعلیٰ ملازمتوں کے انٹرویوز میں بے پردگی کو سندِ اہلیت !
میں بازار —“

ملک بھر میں فحش گانے واسے ریڈیو، شراب خانوں کی قطاریں
اور قحبہ خانوں کے آباد پورے روئے زمین پر۔

شہروں میں قدم قدم پر فحش تصویروں واسے سینما،
سچ بتاؤ خدا انکے سامنے اور حضور کی موجودگی میں کیا اس کو تم اسلامی
ثقافت کہہ کر پیش کر سکو گے؟

میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے علماء مسوسے مؤدبانہ گزارش
کروں کہ اے منبر رسول پر تقابض بزرگوں اور اے امت مسلمہ کی رہنمائی
کے مدعیوں یہ دین کے منبر کو چھوڑ کر دنیا پرستوں کی کاروں کے
پچھے دوڑنے میں تم اتنے باو پاکوں ہو گئے ہو۔ کوئی غرض پرست
ایسا نہیں رہا جن نے اپنے اعمالِ تبلیغ کے جواز کے لئے تم میں سے کسی
نہ کسی کو دینِ قیم کا استہزا کرنے کے لئے مامور نہ کر رکھا ہو۔ تم جو امام
ابو حنیفہ کی پیروی میں سعادت سمجھتے ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو بادشاہوں
کے درباروں میں بھی جانا حرام سمجھتے تھے۔ تم جو احمد بن حنبل کے مدح
خوان ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو حق کے لئے برس برس تک کڑے کھا سکتے
تھے۔ اور جاہل بادشاہوں کے سامنے کلمہ حق کہہ کر جیل جاسکتے تھے
تم جو امام مالک کے معترف ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو حق کے لئے سخت
سے سخت اذیت سہہ سکتے تھے۔ تم نے تو امام شافعی کی حق پرستی
کا بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ تم نے تو امام حسین کے جید بے قربانی کو بھی سراہا

رسوا کر دیا۔

میں تم سے کیا کہوں کہ تم نے ہر قدم پر اللہ اور اس کے نبی کے احکام سناٹے اور پھر ہر قدم پر انہیں احکام سے چشم پوشی کی تم نے شاہوں کو لٹکارا اور انہیں کے ہاتھوں بک گئے۔ تم نے حق کی پشت پناہی کی اور اسے ہی پیٹھ دکھا گئے۔ جب بھی باطل نے مٹتا اور کرو فریب کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھایا۔ تم نے ہمیشہ بعیرت مومن کو بلاٹے طاق رکھ کر اسے چوم لیا۔ بلخ بخارا اور سمرقند جہاں سے امام بخاری جیسے بزرگان دین اٹھے اور جہاں صدیوں اسلام سر بلند رہا وہاں تم نے دہریوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں خود اپنے ہتھیار دیتے اور جب انہوں نے تمہاری ایک ایک گردن سے خون بہا دیا اور تمہاری مساجد کے ہر مینار پر لکھ دیا کہ "آج سے یہاں بندہ کا نام بلند نہ ہوگا۔" تو پھر تمہیں معلوم ہوا کہ تم نے اپنی ہی تلواروں سے اپنے گلے کاٹے تھے۔ تم نے ترک کی میں ان لوگوں کو قوت دی جو اسلام سے سزا دتھے۔ اور جب انہوں نے وہ سب کچھ جو اسلام کا تھا اتار کر پھینک دیا اور وہ سب کچھ جو مغرب کی دہریت کا تھا اوڑھ لیا تو تمہیں ہوش آیا کہ تم نے اسلام ہی کا مورچہ اکھاڑ پھینکا تھا۔

آج تم پھر آزمائش میں پڑ گئے ہو۔ آج وقت تم سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنے حجروں میں سے نکلو اور اپنے ملک کے معاشرے کو اسلام

کے لئے تیار کر دو۔ اگر یہاں بھی تم نے اپنی تاریخ کہنے کو دہرایا اور اسلام کے خلاف کفر و انحراف کے لہجے میں اپنے فتوؤں کی تلواریں عثمادیں تو کیا تم بتا سکو گے کہ اسلام کے مورچے کو اس سر زمین سے بھی اٹھا کر کے بعد تم نے کس زمین کے سینے پر اور کس آسمان کے تلے اپنی پناہ گاہ تلاش کر رکھی ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس ملک کے بعض لڑیوں، شاعروں، مقررہوں، صحافیوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی عرض کروں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے مندر علم و دانش کا پُر و قار مقام چھوڑ کر دربار داروں کا کام کیوں سنبھال لیا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ تم کسی اقتدار پسند کے اشارے پر شکائے جاتے ہو اور سوسائٹی میں سے چُن چُن کر ہر اس شخص کی گپڑی اچھالتے نظر آتے ہو جو تمہیں شریف اور حق گو نظر آتا ہے۔ علم کا کام انسان کو تذبذب اور شکوک کی دھندلاہٹ سے حق کی چمک اور وضاحت کی طرف لے جانا ہے لیکن یہ علم تمہیں کس کتاب کا حاصل ہوا ہے جو تمہیں ہر بھاری جیب کے پیچھے دوڑا دیتا ہے اور ہر اونچے تخت کے سامنے دعوت بستہ لا کھڑا کرتا ہے۔ تمہارا قلم اور تمہاری زبان تو خدا کی امانتیں ہیں جنہیں خدا ہی کی راہ میں اسی کا کلمہ بلند کرنے کے لئے چلنا چاہیے۔ اس لئے کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ خدا ہی اس

کائنات کا مالک، خالق، آقا، حاکم اور مدبر ہے۔ بندوں کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کی رضا پر اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ اس لئے اپنے دوسرے بندوں کی نسبت تمہیں گویائی اور قلم کی قوتیں زیادہ عطا فرمائی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم اسی نسبت سے ان قوتوں کو خدا کی راہ میں صرف کرتے جس نسبت سے اس نے تمہیں دوسروں کی نسبت یہ زیادہ دی ہیں۔ لیکن اخباروں کے کالم، کتابوں کے صفحے اور جلسوں کے پلیٹ فارم گواہ ہیں کہ تم نے اپنے قلم کا لفظ لفظ خدا کی مرضی کے خلاف اور اپنی زبان کا حرف حرف خدا کی منشا کے خلاف صرف کر ڈالا ہے جو خدا کا بندہ بھی اپنا فرض پہچانتے ہوئے اپنا حق عبودیت ادا کرنا چاہیے، تم قلم کے لٹھ اور زبان کے بھالے لے کر پیچھے بڑھ جاتے ہو اور جو اقتدار پسند اور نفس پرست تمہیں اپنی اغراض کا خادم بنانا چاہے تم فوراً اپنی خدمات اس کے سامنے پیش کر دیتے ہو۔ تم نے ان لوگوں کے بے شمار قصیدے لکھے جن کی ذات سے الفاظ کا پردہ ناموس بھی چاک ہوتا تھا اور تم نے ان لوگوں کو ملعون، مغلوب کیا جن کی عصمت و پاکیزگی اور خلوص و دیانت داری پر ان کے دشمنوں کا دل بھی چکے چکے گواہی دیتا رہا۔ انہوں نے کہ زمانے کے چوراہے پر تم نے اپنی بیٹیاں اپنے ہی ہاتھوں سے ذلت کی چو کھٹ پور کر دیں۔ اور تمہارے ضمیر نے تمہیں ایک چکنی بکنی

تم نے اپنے ہاتھوں اپنی گلاخود قار نوچ کر کیا ڈخانے میں ڈال دی اور تمہاری عمت نے
ایک سسکی تک نہ لی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس ملک کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں
اور زمینداروں سے کہوں کہ اے زندگی کے پر تمنا شیدا یو! اور اے عیش جہاں کے تمنا یو!
تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ سونے کی جس رتھ پر تم نے اپنا سفر زندگی شروع
کر رکھا ہے یہ تمہیں کسی منزل تک نہ پہنچائے گی۔ تم نے مغربی سرمایہ داری اور
سامراجیت کے تخت پر بیٹھ کر برسوں تک مظلوم انسانوں کا خون چوسا ہے اور
برسوں تک مظلوموں کے خون پینے سے اپنے جام دنیا کو دو آتشہ کیا ہے۔
لیکن اب اچھی طرح سمجھ لو کہ جو طوفان اب ایام کے دوش پر سوار دنیا
کے چہار طرف پھیننے کے لئے شمال کی طرف سے اٹھ رہا ہے۔ اس
کی زد سے تمہیں نہ سونے کی کشتیاں بچائیں گی اور نہ رشتوں کے
چتو پار لگائیں گے۔ تم ہزار نوٹوں کی دیواریں اپنی معافیت کے
لئے اور ہزار چپک بکوں کے انبار اپنی پناہ کے لئے لگا دو۔ انقلاب
کا ایک ریلہ ہی ان سب کو بہا لے جائے گا۔ زندگی کے افق سے
دو انقلاب ابھر رہے ہیں اور انہیں تمہارے سروں پر سے بہر حال
گزرنا ہے۔ اسلام کا انقلاب تم سے اتنا ہی لے گا جتنا تم نے اپنے
ظلم اور لالچ و خود غزنی سے دوسرے انسانوں سے چھینا ہے۔ وہ
تم سے حرام بھڑاٹے گا اور حلال پر قانع رہنے کے لئے مجبور کرے
گا۔ وہ تمہیں زندہ رہنے اور جائز طور پر پھیلنے پھولنے کا حق دے گا۔
وہ تم پر اس طرح ظلم نہیں کرے گا جس طرح تم دوسرے انسانوں

پر ظلم ڈھاتے رہے ہو۔ لیکن سرخ انقلاب جو تمہارے دروازے پر کھڑا
 دستک دے رہا ہے۔ اس کی زد میں آ کر تم کسی پتہ میں نہ چھپ سکو گے
 کوئی بل تمہاری حفاظت نہ کرے گا اور کوئی گوشہ تمہیں امان نہ دے
 گا۔ تمہاری پھولی ہوئی ہر تو ند پھاڑی جائے گی اور تمہارا ٹکلا ہوا
 ہر نوالہ اگلا یا جائے گا۔ سڑکیں تمہاری پھیٹی ہوئی تو ندوں سے معمور
 ہو جائیں گی۔ سرخ سپاہی تمہاری ٹھوڑوں سے فٹ پال کھیلے گی
 درختوں پر اونگھنے والے گدھ تمہاری بے جان لاشوں کو تاکیں
 گے اور فضا میں منڈلانے والے کوسے اور چیلے تمہارے گوشت
 پر اپنی صنیاقتیں اڑائیں گے۔ ان دونوں انقلابات کی گونج اس
 ملک میں سنائی دے رہی ہے۔ ایک انقلاب اس کی حدود کے
 اندر سانس لے رہا ہے اور دوسرا اس کی حد دراز کی سرحدوں سے
 ٹکرا رہا ہے۔ تمہیں بہر حال ایک کی نذر ہوتا ہے۔ اب یہ تمہاری اپنی
 پسند ہے کہ تم کس کا ساتھ دو۔ اور کسے اپنی متاعِ زندگی حوالے کرو
 اب بہر حال تمہیں اپنے اور عوامی کنسٹرٹنڈھانے ہوں گے۔ اب
 بہر حال تمہیں سپرنگوں والے گدوں سے اٹھایا جائے گا۔ اب
 زیادہ عرصے تک تم پوری حیوانیت سے دادِ عیش دیتے ہوئے
 اپنے ننگے کے چھانک پر۔ ایک بھوکے انسان کو تڑپتا ہوا
 چھوڑ نہ سکو گے۔ اب تمہیں نرم و گداز بستروں سے اور بلند
 بتکوں سے نکلنا ہی پڑے گا۔ اب تم زندگی کی ساری عیش سمیٹ

کر اپنی تجوری میں بند نہ کر سکو گے۔ اب تمہیں وہ بند کھولنے ہوں گے جو تم
 نے دولت کی روانی میں لگا رکھے ہیں۔ اب اپنی ہستی کو برقرار رکھنے
 کے لئے تمہیں کسی ایک انقلاب کا ساتھ دینا ہو گا۔ مغربی سرمایہ پرستی
 کا ست دنیا کے چوراہے پر ٹوٹ کر پاش پاش ہوا جا رہا ہے اور اگر
 تم نے اپنی پٹانیاں اسی شکستہ ست کے سجدوں کے لئے وقف نہیں
 تو یاد رکھو اسی ست کے ٹکڑے سے تمہیں کچل کر رکھ دیں گے۔ میرا دل
 چاہتا ہے کہ تمہیں آگاہ کر دوں کہ اگر تمہیں حق و انصاف اور رزق
 حلال سے گریز نہیں ہے تو اس انقلاب کو لانے کے لئے آگے
 بڑھو۔ جو تمہیں بنیادی انسانی حقوق پورے کے پورے دے گا۔
 اور تمہارا حق تم سے نہ چھینے گا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس ملک کے محنت کش کسانوں، مزدوروں
 اور عوام سے بھی کہوں کہ اے بازارِ زندگی کے سہی دست بیوپارے
 اے میرے مظلوم بھائیو۔ یہ کون ہے جس نے تمہارے جسموں کا لباس
 ایک چھین لیا ہے اور تمہارے شکموں کو رزق حلال سے خالی کر دیا ہے
 یہ کون ہے جس نے انسانیت کا تمام وقار اور نفس کی تمام عزت
 تم سے پھینکی ہے۔ جس نے تم سے سہارے کی آخری لٹھی اور
 سائے کی آخری دیوار بھی چھین لی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں
 رزق کمانے کے غیر مساوی مواقع کی تقسیم نے کچل دیا ہے اور

تمہیں اس جو تک سے شکایت ہے جس نے مدتوں تک تمہارے جسموں سے جاگیردار، کارخانہ دار، اور سرمایہ دار بن کر زندگی کا خون چوسا ہے۔ لیکن تمہارا غصہ بے جا ہو گا۔ اگر تم پرزوں پر و انت پلٹتے رہو اور پوری مشین کو اجازت دو کہ وہ نصب رہے اور تمہاری لسیوں کو اپنی پیہم ضربوں سے کڑکڑاتی رہے۔ یہ لوگ تو اس سرمایہ داری نظام کے کل ٹرڈ سے ہیں جو ایک مدت سے اس سر زمین پر مستط ہے۔ مدت سے تمہارا خون تیل بن بن کر اس نظام کی مشینری کو چلا رہا ہے۔ تمہارا اصل دشمن تو یہ نظام ہے جس کے کارندوں نے تمہاری شمع حیات کا روغن چوس لیا ہے۔ یہ فرنگی الحاد ہے جو انسان کو شرف انسانیت سے محروم کئے دیتا ہے اور طاقتور کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے عیش کے لئے جس شمع کو چاہے گل کر دے اور جس سانس کو چاہے روک دے۔ تمہارے ہاتھ میں اگر کوئی قوت ہے تو اس نظام پر ضرب لگاؤ۔ اور اس نعرے کے ساتھ لگاؤ کہ ملک خدا کا ہے اور اس میں سے روزی حاصل کرنے، کمانے اور زندہ رہنے کا حق خدا نے ہر انسان کو دیا ہے جو خدا کی زمین پر اپنی ٹھیکیداری قائم کرتا اور دوسروں کو محروم کرتا ہے وہ درندہ ہے اور اس موذی دندے کو بے ہزر کرنے کے لئے اخلاقی قوانین کے پجرے میں بند کرنا ضروری ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں یہ بھی بتاؤں کہ تمہاری بیداری اور
 بنیادی حقوق کی طلب نے سرمایہ دار کو اور بھی بہت سے ہتھکنڈے
 سکھا دیئے ہیں اور جب تک تم اس کا رزارِ ہستی میں ایک مجاہدانہ
 بصیرت لے کر داخل نہیں ہو گے ڈر ہے کہ وہ تمہیں اپنے سرمائے
 کے مختلف پھندوں میں سے کسی ایک میں ضرور پھانس لے گا اور
 اب اس نے ایک نیا پھندا ایجاد بھی کر لیا ہے۔ جسے وہ اشتراکیت
 کہتا ہے۔ اب وہ تمہارے سامنے روٹی اور مشترک ملکیت کے نعرے
 پھینکتا ہے۔ تاکہ تم اپنے آپ پر مغرب کی ملحد جمہوریت کا ایک
 غمگین ترین چربہ مسلط کر لو جو سرتا پا آمرتیت ہے۔ اور جب تمہاری
 ہمدردی کے نعرے پر تمہاری ہی مدد سے وہ اپنا اشتراکی نظام
 قائم کر لیتا ہے تو پھر تم پر دو وقت کی روٹی کا دروازہ کھول کر باقی
 سب دروازے بند کر دیتا ہے۔ وہ تمہیں دو وقت کا چارہ دے کر
 پالتو مویشی کی طرح تمہارے گلے میں رشتہ ڈال کر اپنے کھونٹے سے
 باندھ لیتا ہے۔ دو وقت کی روٹی کے عوض تمہیں عمر بھر کے لئے
 ایک جیوان کی طرح استعمال کرتا ہے۔ نہ زمین تمہاری ہوتی ہے نہ
 مکان تمہارا ہوتا ہے۔ نہ جائداد تمہاری ہوتی ہے نہ محنت کا پھل تمہارا
 ہوتا ہے۔ جتنی کہ تمہاری بیوی تمہاری نہیں ہوتی۔ تمہارے بچے تمہارے
 نہیں ہوتے بلکہ یہ سب کچھ اس بڑے عظیم سرمایہ دار کا ہوتا ہے جو
 دس گھنٹے کام لینے کے بعد تمہیں دو وقت کی روٹی دیتا ہے۔ تم

اس سرمایہ دار کے خلاف ہڑتال کر کے کسی دوسرے کارخانے میں نہیں
 جا سکتے۔ تم اس زمیندار کو چھوڑ کر کسی دوسرے زمیندار سے زمین
 نہیں لے سکتے۔ اس لئے کہ وہ کھیت اور وہ کارخانہ سب کچھ اس
 ایک ہی بڑے سرمایہ دار کا ہوتا ہے۔ تم اس عظیم سرمایہ دار کو
 چھوڑو گے تو وہ تمہیں بھوکا مار دے گا۔ تم اس کے خلاف مظاہرہ
 نہ کر سکو گے۔ اس کے خلاف جلوس نہ نکال سکو گے۔ اس لئے کہ
 وہ بڑک بھی اس سرمایہ دار کی ہوگی۔ تم اس سے باغی ہو کر دوکان
 سے راشن تک نہ لے سکو گے۔ اس لئے کہ راشن کی دوکان بھی اسی
 سرمایہ دار کی ہوگی اور وہ اتنا بڑا سرمایہ دار ہوگا کہ حکومت بھی اسی
 کی ہوگی۔ پھر وہ حکومت تمہیں حیوانوں کی طرح زندہ رکھے گی۔ اور حیوانوں
 کی طرح ہی مار دے گی۔ پھر سوچو کہ تم کیا کرو گے، کدھر جاؤ گے جہاں
 تم فریاد بھی نہ کر سکو گے۔ اس لئے میں تم سے پوری دل سوزی سے
 کہتا ہوں کہ میرے عزیز بھائیو انسانیت کے اس مقتل عظیم سے
 پناہ مانگو کہ چالاک سرمایہ دار نے سخت ترین پھندہ اگر تمہیں پھنسانے
 کے لئے تاریخ کے دور میں کبھی لگایا ہے تو وہ مہر خ انقلاب کا پھندہ
 ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہاری رگ رگ میں یہ لہین اتار دوں
 کہ تمہاری قلاح اور پناہ تمہارے دکھوں کا علاج اور تمہارے زخموں
 کا مرہم تمہاری بھوک پیاس، روٹی کپڑے اور ساری حاجات کا

کفیل ایک اسلامی نظام ہی ہو سکتا ہے۔ وہی نظام جو تمہارا دین اور تمہارا ایمان بھی ہے۔ تمہارا اپنا عقیدہ اور ایمان ہے۔ تم نے آج تک اس کی چھاؤں میں زندگی کا کوئی سانس نہیں لیا۔ یہی تمہاری میری اور دنیا کے ہر انسان کی بد قسمتی ہے۔ اب جس طرح تم نے اپنے ملک کے حصول کے لئے تاریخ کو اپنے ہاتھ سے موڑ دیا تھا اسی طرح اب اٹھنا ہوگا تمہارے اٹھنے بغیر یہاں کوئی فتنہ بھی نہ بیٹھے گا۔

میرادل چاہتا ہے کہ اس ملک کی ہواؤں سے کہوں کہ کفر و ضلالت اور فسق و فجور کی گندگی کو مغرب پرستی اور دہریت کی نجاست کو اپنے دوش پر لا کر کہیں دور لے جاؤ۔ بہت دور بحرِ اوقیانوس کے گہرے پانیوں میں یا گننام جزیروں میں لے جا کر ڈال دو اور مدینۃ المرسلین کی گم گشتہ بادِ بہاری کو کہیں سے ڈھونڈ کر اپنے کندھوں پر لاؤ لاؤ اور اس ملک کے گوشے گوشے کو اس پاکیزگی سے معمور اور معطر کر دو۔



تحریک اسلامی

گزشتہ ربع صدی سے مسلمانوں کے معاشرے میں اصلاح و تبلیغ کا ہمہ پہلو

کام کر رہی ہے۔

● اسلام ایک متعین نصب العین "اقامتِ دین" ہے۔

● اس نے نئی مسائل کے بارے میں ہر موضوع پر اپنی پالیسی اور نکتہ نظر

کا اظہار کیا ہے۔

● اس کے دینی، معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور روحانی نظریات ہیں۔

● اس کا ایک وسیع لٹریچر ہے جو متعدد کتابوں پر مشتمل ہے

تحریک اسلامی کو سمجھنا ایک نئی فریضہ اور آپ کی دینی ضرورت ہے اور

اس سارے علمی عملی اور نظری کام کو سمجھنے کے لئے وسیع مطالعہ اور طویل

وقت کی ضرورت ہے۔ اس کام کو آسان کرنے کے لئے جناب اسعد گیلانی نے

تحریک اسلامی، ایک نظر میں

کے عنوان سے ایک مختصر گائیڈ بک مرتب کی ہے جو تحریک اسلامی

کے اپنے لٹریچر کے بہترین ذمہ دارانہ انتخاب پر مشتمل ہے۔

سو سے زائد صفحات : کتابت طباعت و عیادہ

ادارہ ادب اسلامی

سٹیٹلائٹ ٹرانسمیٹر گودھا

